دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۱۰ | صفر المظفر – ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ مطابق اگست – ستمبر ۲۰۲۶ء | شمارہ: ۸-۹

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند – ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.**:** 2133/57
Vol. No. 110, Issue No. 8-9, Aug.-Sep. 2026 अगस्त–सितम्बर 2026
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 100/= | Annual Subscription Rs. 500/=

Annual by Regd Post. Rs. 700/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۱۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز		محمد سلمان بجنوری	۳
قرآنیات	ترجمہ اور تفسیر کا معتدل معیار	ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۴
فقہیات	موجودہ حالات میں عوامی جگہوں میں نماز	مولانا محمد عاصل کمال اعظمی	۱۵
//	ہمارے فقیہ بننے میں رکاوٹیں	ڈاکٹر مفتی عبداللہ فردوس	۲۵
فکر ونظر	مسلمان اور سائنس/صحیح زاویۂ فکر	ڈاکٹر مبسر حسین رحمانی	۳۳
//	فیمنزم اور شاہ ولی اللہ کے عمرانی افکار	مولانا غالب شمس قاسمی	۴۸
اصلاح ورہنمائی	سیرت نبوی ﷺ اور سائبر اخلاقیات	مولانا فضیل اختر قاسمی	۵۳
//	دعوت وتبلیغ کے نبوی اصول	ڈاکٹر فہد انوار	۵۸
//	بنتِ حوا کا وقار حجاب میں!	مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی	۶۶
//	تقویٰ کی اہمیت	مولانا محمد عادل ارریاوی	۷۶
//	اولاد ایک امانت	مولانا محمد توقیر رحمانی	۷۹
//	گفتگو کا سلیقہ	مولانا فضیل اختر قاسمی بھیروی	۸۳
تذکار اکابر	حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ اور ان کی فقہی خدمات	مولانا محمد اللہ خلیلی قاسمی	۸۷
//	حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری قدس سرہ	مولانا عبدالرؤف غزنوی	۱۰۴

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/700 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

حرف آغاز

محمد سلمان بجنوری

ایک بار پھر وطن عزیز میں ایمان ویقین کی آزمائش کا موسم آگیا ہے،حکومت کی جانب سے قومی گیت (وندے ماترم) اور وہ بھی پورے کا پورا، لازم کردیا گیا ہے اور اس بارے میں کانگریس کے،صرف ابتدائی دوبند،گانے کے فیصلہ کوآئین کی خلاف ورزی اور حب الوطنی سے متصادم کہا جارہا ہے۔اس سلسلے میں ہم حکومت ہنداور برادرانِ وطن سے صرف دو باتیں کہنا چاہتے ہیں۔

(۱)وندے ماترم کے صرف دوبند،گانے پر اکتفار کرنے کا فیصلہ کسی سیاسی پارٹی کا سیاسی فیصلہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ قومی اتحاد کا ضامن ایسا فیصلہ ہے،جس کا مشورہ رابندرناتھ ٹیگور نے دیا تھا اوران کے مشورے کے بعد ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اس کواختیار کیا تھا اس لیے کہ ابتدائی دوبند چھوڑ کر باقی اشعار میں ملک کی ایک بڑی آبادی کے عقائد سے متصادم تعبیرات ومضامین پائے جاتے ہیں۔

(۲)اس سلسلے میں مسلمانوں کی پوزیشن پر حکومت کوغور کرنا چاہیے، جہاں تک ملک سے وفاداری کا معاملہ ہے اس میں مسلمانوں کا کردار، آزادی سے لے کرآج تک بالکل شفاف ہے۔ مسلمانوں نے ملک دشمن کسی بھی کارروائی کی کبھی حمایت نہیں کی ہے اور وہ پوری طرح آئین ہند کے پابند ہیں؛لیکن وندے ماترم یا کسی بھی ایسے نعرے یا ترانے کے معاملہ میں جوعقیدۂ توحید سے متصادم ہو،مسلمان مجبور ہیں۔اس لیے کہ توحید کے خلاف کسی بھی لفظ کے بولنے سے وہ مسلمان ہی نہیں رہتے، یہاں تک کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آخری درجہ میں محبت، احترام اور عقیدت رکھنے کے باوجود،اُن کے لیے عبادت جیسے کسی لفظ کا تصور نہیں کرسکتے،اس لیے ہماری گزارش ہے کہ اس مسئلہ میں جذباتی یا سیاسی انداز سے اجتناب کرتے ہوئے آئین میں دی گئی مذہبی آزادی کی ضمانت کو ملحوظ رکھا جائے۔

ترجمہ اور تفسیر کا معتدل معیار

(۲/۲)

بقلم: ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

اصولِ تفسیر کی چند اہم کتابیں

علمِ تفسیر کے طالبِ علم کو خصوصیت کے ساتھ درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے:

1-الاتقان فی علوم القرآن   مصنف: امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ

علومِ قرآن کا ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا، جس میں قرآنِ کریم سے متعلق سیکڑوں مباحث جمع کردیے گئے ہیں۔

2-البرہان فی علوم القرآن   مصنف: امام بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ

علومِ قرآن کی اولین اور بنیادی مراجع میں سے ایک اہم کتاب۔

3-مناہل العرفان فی علوم القرآن   مصنف: شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمہ اللہ

یہ علومِ قرآن کی نہایت مفصل اور جامع کتاب ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے نصابِ ''تکمیلِ تفسیر'' میں اس کی بعض اہم بحثیں پڑھائی جاتی ہیں، مثلاً:

(الف) نزولِ قرآن علیٰ سبعۃ احرف

(ب) جمعِ قرآن

(ج) تفسیر اور مفسرین

اگرچہ نصاب میں اس کے منتخب ابواب شامل ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب مطالعے کے لائق ہے۔ علم تفسیر کے طلبہ کو پوری کتاب ضرور پڑھ لینی چاہیے!

4-التبیان فی علوم القرآن   مصنف: شیخ محمد علی صابونی رحمہ اللہ

عصرِ حاضر کے طلبہ کے لیے نہایت مفید اور مرتب انداز میں لکھی گئی کتاب۔

5۔الفوزالکبیر فی اصول التفسیر مصنف: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ

یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر؛ لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے نہایت عظیم ہے۔علومِ قرآن اور اصولِ تفسیر کے بہت سے بنیادی مباحث کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے انتہائی حکیمانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔

الفوزالکبیر کی عظمت

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استاذِ محترم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ سے اصولِ تفسیر کی رہنمائی طلب کی تو حضرت نے فرمایا:

''ایک مختصر سا رسالہ اصولِ تفسیر میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے جس کا نام الفوزالکبیر ہے۔''

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جب میں سندھ پہنچا تو مجھے الفوزالکبیر کا نسخہ ملا۔اس کی پہلی فصل کا مطالعہ کر کے میں مطمئن ہو گیا کہ ان شاء اللہ علمِ تفسیر مجھے حاصل ہو سکتا ہے۔پھر اس دن سے آج تک میں ان کے مسلک سے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکا۔'' (ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، 1359ھ، ص:248)

حقیقت یہ ہے کہ الفوزالکبیر برصغیر میں اصولِ تفسیر کے باب میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اس مختصر رسالے نے بعد کے بے شمار مفسرین، مترجمین اور اہلِ علم کی فکری رہنمائی کی ہے، اور آج بھی قرآنِ کریم کے طالبِ علم کے لیے یہ کتاب اولین مطالعے کی مستحق ہے۔

قرآنِ کریم میں نسخ کا مسئلہ

زمانۂ طالبِ علمی کے دوران ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔حضرت علمی ذوق رکھنے والے بزرگ تھے اور اپنی مجالس میں طلبہ سے علمی سوالات بھی کیا کرتے تھے؛ تاکہ ان کی علمی استعداد کو بیدار کریں اور اہم مسائل کی طرف توجہ دلائیں۔

چنانچہ ایک مجلس میں حضرت نے طلبہ سے سوال فرمایا:

''قرآنِ کریم میں کتنی آیتیں منسوخ ہیں؟''

ہم خاموش رہے۔ہم اس انتظار میں تھے کہ حضرت خود اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں گے؛ چنانچہ حضرت نے فرمایا:

''سنو! قرآنِ کریم میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔''

پھر حضرت نے اس موقف کو راجح قرار دیا اور اس سلسلے میں حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ کی کتاب ''قرآن محکم'' کی طرف توجہ دلائی۔

مسئلۂ نسخ کی اہمیت

حضرت مولانا محمد ولی رحمانی رحمہ اللہ نے اس موقع پر ایک اہم نکتہ بھی بیان فرمایا کہ اگر قرآنِ کریم کی آیات کو منسوخ تسلیم کیا جائے تو غیر مسلموں کے بعض اعتراضات کا جواب دینا دشوار ہو جائے گا؛ کیونکہ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر بعض آیات پر اب عمل نہیں کیا جاتا تو ان کی موجودگی کا کیا مقصد ہے؟

حضرت کی اس گفتگو کے بعد ناچیز نے اس مسئلے کا از سرِ نو مطالعہ کیا۔ اگر چہ مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ کی کتاب پہلے بھی پڑھ چکا تھا؛ لیکن اس توجہ دہانی کے بعد اس موضوع کا مختلف مصادر سے دوبارہ جائزہ لیا۔ خصوصاً حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی ''الفوز الکبیر''، حضرت استاذ محترم مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ کی عربی شرح ''العون الکبیر'' اور حضرت مفتی محمد امین پالن پوری مدظلہ کی اردو شرح ''الخیر الکثیر'' کا مطالعہ کیا، جن میں اس مسئلے پر نہایت اہم گفتگو موجود ہے۔

اختلاف کی اصل بنیاد

حقیقت یہ ہے کہ مسئلۂ نسخ میں بنیادی اختلاف نسخ کے مفہوم کے تعین سے پیدا ہوا ہے۔ متقدمین اور متاخرین کے درمیان نسخ کے معنی میں فرق پایا جاتا ہے۔

متقدمین کے نزدیک نسخ

لغوی اعتبار سے نسخ کے معنی ہیں: ازالہ کرنا، ہٹا دینا یا کسی سابق حکم میں تبدیلی پیدا کرنا۔

اسی بنا پر متقدمین نسخ کا اطلاق بہت وسیع معنوں میں کرتے تھے۔

چنانچہ ان کے نزدیک درج ذیل صورتیں بھی نسخ میں داخل تھیں:

1- مطلق حکم میں قید کا اضافہ۔

2- عام حکم کی تخصیص۔

3- کسی حکم کی مدتِ عمل کی تعیین۔

4- کسی لفظ کو متبادر معنی سے غیر متبادر معنی کی طرف پھیرنا۔

5- جاہلی رسوم و عادات کا ازالہ۔

6- سابقہ شریعتوں کے بعض احکام کا خاتمہ۔

اس وسیع مفہوم کے نتیجے میں متقدمین کے ہاں منسوخ آیات کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی؛ بلکہ بعض حضرات نے پانچ سو سے زیادہ آیات کو بھی منسوخ قرار دیا۔

متاخرین کی اصطلاح

بعد کے اصولیین اور مفسرین نے نسخ کو ایک خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا۔

چنانچہ نسخ کی تعریف یوں کی گئی: بيانُ انتهاءِ حكمٍ شرعيٍّ بطريقٍ شرعيٍّ متراخٍ عنه حتى لا يجوزَ امتثالُه.

یعنی: ''کسی شرعی حکم کے خاتمے کو ایسے بعد میں آنے والے شرعی حکم کے ذریعے بیان کرنا کہ سابق حکم پر عمل کرنا باقی نہ رہے۔''

اس تعریف کے مطابق نسخ صرف اسی صورت میں ہوگا جب ایک شرعی حکم مکمل طور پر ختم ہوجائے اور اس پر عمل کی گنجائش باقی نہ رہے۔

متاخرین کے نزدیک منسوخ آیات

اسی اصطلاحی تعریف کی بنیاد پر علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں امام ابن العربی رحمہ اللہ کے موقف کی موافقت کرتے ہوئے تقریباً اکیس آیات میں نسخ کو تسلیم کیا ہے۔ بعد کی تنقیح کے بعد ان میں سے بھی بعض آیات محلِ بحث قرار پائیں اور تعداد انیس ہوگئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ان تمام آیات کا دوبارہ جائزہ لیا اور متاخرین کی اصطلاح کے مطابق بھی صرف پانچ آیتوں میں نسخ کو برقرار رکھا؛ چنانچہ ان کے نزدیک بھی منسوخ آیات کی تعداد انتہائی محدود رہ جاتی ہے۔

''قرآن محکم'' کا موقف

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''قرآن محکم'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قرآنِ کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جسے اصطلاحی معنی میں منسوخ قرار دیا جاسکے۔

ان کے نزدیک جن مقامات کو نسخ کہا گیا ہے، ان میں سے اکثر درحقیقت:

-تخصیص، -تقیید، -توضیح، -تدریجِ احکام، -یا حالات کے اختلاف

کی مثالیں ہیں، نہ کہ حقیقی نسخ کی۔

اسی موقف کو حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ نے ''العون الکبیر'' میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، جب کہ حضرت مفتی محمد امین پالن پوری مدظلہ نے ''الخیر الکثیر''میں بھی اسی رجحان کی تائید فرمائی ہے۔

حضرت عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ کی وضاحت

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے موقف کی تشریح کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ بیان فرمایا ہے:

''شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس اصطلاح پر قرآن میں منسوخ نہیں مانتے؛ لیکن واضح رہے کہ شاہ صاحب کا بیان اس سلسلے میں حکیمانہ ہے۔ قوم کی عام حالت کو مدنظر رکھ کر انھوں نے اس مسئلہ کو تدریجاً سمجھانے کی کوشش کی ہے۔'' (ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، ص:256)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے مسئلۂ نسخ میں نہایت معتدل اور حکیمانہ منہج اختیار فرمایا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسئلۂ نسخ میں اہلِ علم کے مختلف اقوال موجود ہیں:

- متقدمین نے نسخ کا مفہوم وسیع رکھا۔
- متاخرین نے اس کو محدود اصطلاحی معنی میں استعمال کیا۔
- بعض معاصر محققین نے قرآنِ کریم میں حقیقی نسخ کے وقوع ہی کا انکار کیا ہے۔

اس لیے طلبۂ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے کو تاریخی اور اصولی پس منظر کے ساتھ سمجھیں، اور مختلف اکابر کے دلائل کا مطالعہ کرکے رائے قائم کریں۔

جلالین شریف اور مسئلۂ نسخ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اگر ''الاتقان'' میں منسوخ آیات کی تعداد بہت محدود بیان کی ہے، تو پھر تفسیر جلالین میں بہت سے مقامات پر نسخ کی تصریح کیوں ملتی ہے؟ ناچیز کی رائے میں اس کی ایک ممکنہ توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ تفسیر جلالین کے آخری پندرہ پارے کے مؤلف علامہ جلال الدین محلی رحمہ اللہ تھے، جنھوں نے اپنے زمانے کے معروف تفسیری منہج کے مطابق بعض آیات میں نسخ کا ذکر کیا تھا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جب بقیہ تفسیر مکمل کی تو انھوں نے مجموعی اسلوب اور منہج کو برقرار رکھا؛ اس لیے بہت سے مقامات پر وہی تعبیرات جاری رہیں جو محلّی نے اختیار کی تھیں۔

یہ محض ایک توجیہ ہے، حتمی فیصلہ نہیں۔ اہلِ علم مزید غور وتحقیق کے ذریعے اس سلسلے میں دوسرے احتمالات بھی پیش کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسئلۂ نسخ کا تعلق صرف آیات کے مفہوم سے نہیں؛ بلکہ اصطلاحات، مناہجِ تفسیر اور مختلف ادوار کے علمی رجحانات سے بھی ہے اور اسی وجہ سے یہ علومِ قرآن کے اہم اور دقیق مباحث میں شمار ہوتا ہے۔

اسرائیلی روایات سے احتراز

قرآنِ کریم کی تفاسیر میں خصوصاً انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات اور قصص کے ضمن میں اسرائیلی روایات بڑی کثرت سے نقل کی گئی ہیں۔ شاید ہی کوئی قدیم تفسیر ایسی ہو جو ان روایات سے بالکل خالی ہو۔ البتہ بعض مفسرین نے حتی المقدور ان سے اجتناب کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ انھوں نے اسرائیلی روایات کی تنقیح اور نقد پر خاص توجہ دی ہے۔ اسی طرح اردو زبان میں تفسیر ''ہدایت القرآن'' میں بھی اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ اسرائیلی روایات کو حتی الامکان شامل نہ کیا جائے۔

حضرت استاد محترم مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ اسرائیلیات کے باب میں نہایت محتاط اور بیدار مغز تھے۔ آپ کا موقف یہ تھا کہ جس واقعے کی تفصیلات قرآن وسنت میں مذکور نہیں، ان کے تعین اور تفصیل کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو مبہم رکھا ہے، ہمیں بھی انھیں مبہم ہی رہنے دینا چاہیے۔ یہی علمی احتیاط ہے اور یہی راجح اور تحقیقی طرزِ عمل ہے۔

تاہم واقعہ یہ ہے کہ اکثر تفاسیر میں قصص کے بیان کے دوران اسرائیلی روایات کا وافر حصہ استعمال کیا گیا ہے۔ تفسیر جلالین میں بھی متعدد اسرائیلی روایات ملتی ہیں اور اس کے رائج حواشی میں واقعات کے غیر مذکور پہلوؤں کو انہی روایات کے ذریعے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے؛ اس لیے جلالین شریف کا مطالعہ کرنے والے طلبہ کو اس باب میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے اور جہاں اسرائیلی روایات کا احتمال ہو وہاں دیگر معتبر تفاسیر سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔

اسرائیلیات کے بارے میں اصولی موقف

اسرائیلی روایات کے بارے میں محدثین اور مفسرین نے بالعموم درج ذیل اصول بیان کیے ہیں:

1- وہ روایات جو قرآن وسنت کے موافق ہوں، ان کی تصدیق میں کوئی حرج نہیں؛ لیکن ان کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ قرآن وسنت خود ہمارے لیے کافی ہیں۔

2- وہ روایات جو قرآن وسنت کے مخالف ہوں، ان کا قبول کرنا جائز نہیں؛ بلکہ انہیں رد کرنا ضروری ہے۔

3- وہ روایات جو نہ موافق ہوں اور نہ مخالف، ان کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے؛ نہ ان کی تصدیق کی جائے اور نہ تکذیب۔

یہی موقف حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے ''علوم القرآن'' میں اختیار فرمایا ہے اور مولانا محمد نظام الدین اسیر ادروی رحمہ اللہ نے اپنی مفید کتاب ''تفسیر میں اسرائیلی روایات'' میں بھی اسی منہج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حقیقی اور غیر حقیقی شانِ نزول

تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شانِ نزول کے باب میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات میں فرق پایا جاتا ہے۔

متقدمین، یعنی صحابۂ کرام، تابعین عظام اور ائمہ اربعہ سے پہلے کے اکابر، ''نزلت فی کذا'' (یہ آیت فلاں واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی) کی تعبیر کو صرف حقیقی سببِ نزول کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے؛ بلکہ اس کا مفہوم ان کے نزدیک زیادہ وسیع تھا۔

چنانچہ وہ کسی ایسے معاملے کے بارے میں بھی یہ تعبیر استعمال کر دیتے تھے جس پر آیت کا حکم یا مضمون صادق آتا ہو، خواہ وہ واقعہ نزولِ قرآن کے زمانے میں پیش آیا ہو یا بعد میں۔ ایسی صورت میں ان کی مراد آیت کی تطبیق ہوتی تھی، نہ کہ حقیقی سببِ نزول۔

اسی طرح بعض اوقات کوئی مسئلہ یا واقعہ پیش آتا، رسول اللہ ﷺ اس کا حکم قرآنِ کریم کی کسی آیت سے مستنبط فرماتے اور صحابۂ کرام کے سامنے اس آیت کی تلاوت کرتے۔ بعد کے راوی اس موقع پر بھی ''نزلت فی کذا'' کی تعبیر استعمال کر دیتے تھے، حالانکہ آیت کا اصل نزول اس واقعہ کے وقت نہیں ہوا ہوتا تھا۔

اس لیے اہلِ علم نے شانِ نزول کی دو قسمیں بیان کی ہیں:

1- حقیقی شانِ نزول

وہ واقعہ جو براہِ راست کسی آیت کے نزول کا سبب بنا ہو یعنی جو عہدِ نبوی میں پیش آیا ہو۔

2- غیر حقیقی شانِ نزول

وہ واقعات یا مسائل جن پر آیت کا حکم منطبق ہوتا ہو، یا جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے

آیت سے استدلال فرمایا ہو،مگر وہ آیت اصل میں ان کے سبب نازل نہ ہوئی ہو۔اس کو تکرارِ نزول بھی کہا جاتا ہے؛اس لیے کہ یہ "نَفث فی الرُوع" کی صورت ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کے دل میں دوبارہ ڈالی گئی۔

اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے شانِ نزول کی روایات میں خلط ملط پیدا ہوجاتا ہے اور بہت سے اشکالات جنم لیتے ہیں۔

وہ آیات جن کے فہم کے لیے شانِ نزول ضروری ہے

اگرچہ قرآنِ کریم کی اکثر آیات اپنے عمومی مفہوم کے اعتبار سے قابلِ فہم ہوتی ہیں؛لیکن بعض آیات ایسی ہیں جن کا صحیح مفہوم شانِ نزول کے بغیر واضح نہیں ہوتا۔

پہلی مثال

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا (التوبۃ:118)

ترجمہ:اور ان تین اشخاص پر بھی اللہ نے خصوصی توجہ فرمائی جن کا معاملہ کچھ مدت کے لیے مؤخر رکھا گیا تھا۔

اس آیت میں مذکور تین حضرات سے مراد:-حضرت کعب بن مالکؓ،-حضرت مرارہ بن ربیعؓ، -حضرت ہلال بن امیہؓ ہیں۔ان کے نام یاد رکھنے کے لیے' مکہ'یاد رکھنا کافی ہے۔

جب تک غزوۂ تبوک میں ان حضرات کی عدمِ شرکت، ان کی توبہ اور ان کے مقاطعہ کے پورے واقعے کو نہ جانا جائے،اس آیت کا مکمل مفہوم سامنے نہیں آتا۔

دوسری مثال

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ. (الأنفال:42)

ترجمہ:جب تم قریب والے کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر تھے؛جب کہ قافلہ تم سے نیچے کی سمت تھا۔

اس آیت کا صحیح مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتا؛جب تک غزوۂ بدر کا پورا پس منظر معلوم نہ ہو،مثلاً:

(۱) مسلمانوں کی پوزیشن کیا تھی؟

(۲) کفار کس مقام پر تھے؟

(۳) ’’عدوۃ الدنیا‘‘ اور’’عدوۃ القصویٰ‘‘ سےکون سے مقامات مراد ہیں؟

(۴) ابوسفیان کا قافلہ کس راستے سے گزر رہا تھا؟

یہ تمام تفصیلات جاننے کے بعد ہی آیت کا منظر اوراس کی معنوی گہرائی واضح ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مفسر اور طالبِ علم دونوں کے لیےضروری ہے کہ جہاں آیت کا مفہوم تاریخی پس منظر پر موقوف ہو وہاں صحیح اور معتبر روایات کی روشنی میں شانِ نزول کی تحقیق کرے۔اس کے بغیر بعض آیات کا مفہوم ادھورارہ جاتا ہےاورقرآنِ کریم کا مطلوبہ پیغام پوری طرح سامنےنہیں آتا۔

تفسیرِ قرآن کے فہم میں پیش آنے والی دوسری دشواریاں

قرآنِ کریم کی تفسیر کو سمجھنے میں متعدد قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ محض عربی زبان کی ابتدائی واقفیت قرآنِ کریم کے دقیق معانی تک رسائی کے لیے کافی نہیں ہوتی۔مفسرینِ کرام نے مختلف علوم کی مدد سے ان دشواریوں کو حل کیا ہے۔ذیل میں ان میں سے چند اہم اسباب کا ذکر کیا جاتا ہے:

1-محذوفاتِ قرآن

عربی زبان کا ایک معروف اسلوب حذف ہے۔ بسا اوقات جملے کے بعض الفاظ حذف کردیے جاتے ہیں اور سیاق وسباق ان پر دلالت کرتا ہے۔ایسے محذوفات کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں؛ بلکہ اس کے لیے زبانِ عربی پر گہری دسترس ضروری ہوتی ہے۔

کئی مواقع پر محذوف الفاظ کی تعیین ہی آیت کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کی کنجی بنتی ہے، اور اگر محذوف کو نہ سمجھا جائے تو معنی میں ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

2-ضمائر کا انتشار

قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر متعدد ضمائر استعمال ہوتی ہیں، جن کے مراجع کا تعین نہایت اہم ہوتا ہے۔اگر ضمیر کا مرجع متعین نہ ہوسکے تو پورا مضمون سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔

اسی لیے مفسرین ضمائر کے مراجع کی تعیین پر خصوصی توجہ دیتے ہیں اور بسا اوقات ایک ہی ضمیر کے متعدد مراجع ذکر کرتے ہیں۔

3-مشترک الفاظ اور تعددِ معانی

عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو متعدد معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔قرآنِ کریم میں جب ایسے الفاظ آتے ہیں تو یہ طے کرنا ضروری ہوتا ہے کہ اس مقام پر کون سا معنی مراد ہے۔

مثال کے طور پر: (۱)حق (۲)امر (۳)نبأ (۴)جعل (۵)شئ

وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کے متعدد معانی لغت میں مذکور ہیں۔ سیاق، سباق اور دیگر قرائن کی مدد سے یہ متعین کیا جاتا ہے کہ آیت میں کون سا معنی مراد ہے۔

4-ایک صنفِ کلام کا دوسری صنف کے معنی میں استعمال

عربی زبان کی فصاحت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات اسم کو فعل کے معنی میں، فعل کو اسم کے معنی میں یا حرف کو کسی دوسرے اسلوب کے قائم مقام استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اسالیب عربی ادب میں معروف ہیں؛ لیکن ان سے ناواقف شخص کے لیے آیت کا مفہوم پیچیدہ ہوسکتا ہے؛ اسی لیے نحو، صرف اور اسالیبِ عربیہ کا علم مفسر کے لیے ناگزیر ہے۔

5-تقدیم وتاخیر اور دیگر نحوی لطائف

بعض مقامات پر الفاظ کی تقدیم وتاخیر، مذکر ومؤنث کے استعمال، تعریف وتنکیر اور دیگر نحوی و بلاغی اسالیب بھی معنی کے تعین میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

کبھی کسی لفظ کو مقدم کرنے سے حصر پیدا ہوتا ہے، کبھی مؤخر کرنے سے کوئی خاص نکتہ واضح ہوتا ہے، اور کبھی نکرہ یا معرفہ لانے سے معنی میں ایسی باریک تبدیلی آتی ہے جسے سمجھے بغیر آیت کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا۔

فہمِ قرآن اور علمِ بلاغت

قرآنِ کریم فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے؛ اس لیے قرآنِ کریم کے دقیق معانی کو سمجھنے کے لیے علمِ بلاغت سے واقفیت ضروری ہے۔

بلاغت کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ:

-کہاں لفظ حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے؟ کہاں مجازی معنی مراد ہیں؟ کہاں کنایہ ہے؟ کہاں تصریح ہے؟ کہاں استعارہ پایا جاتا ہے؟ کہاں تجنیس کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے؟ اور کہاں ترشیح یا دیگر بلاغی محاسن موجود ہیں؟

ان نکات کو سمجھے بغیر قرآنِ کریم کے ادبی اور معنوی اعجاز کا مکمل ادراک ممکن نہیں۔

عربی تفاسیر کی طرف رجوع کی ضرورت

ایسی دقیق اور علمی مباحث میں مفسر اور طالبِ علم دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ معتبر عربی تفاسیر کی طرف رجوع کریں۔

اس مقصد کے لیے خصوصاً: -تفسیر جلالین، -صفوۃ التفاسیر (شیخ محمد علی الصابونی رحمہ اللہ) نہایت مفید اور معاون تفاسیر ہیں۔ جلالین شریف مختصر ہونے کے باوجود نحوی، صرفی اور تفسیری نکات سے بھرپور ہے؛ جب کہ صفوۃ التفاسیر مختلف تفسیری اقوال کا عمدہ خلاصہ پیش کرتی ہے اور بلاغت کو بھی دل نشیں انداز میں بیان کرتی ہے۔

خلاصۂ گفتگو:

قرآنِ کریم کا فہم ایک عظیم نعمت اور ایک مستقل علمی سفر ہے۔ اس سفر میں زبانِ عربی، اصولِ تفسیر، اصولِ فقہ، علمِ عقیدہ، حدیث، تاریخ، بلاغت اور دیگر معاون علوم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جتنا انسان ان علوم میں مہارت حاصل کرتا جاتا ہے، اتنا ہی قرآنِ کریم کے معارف وحقائق اس پر منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآنِ کریم کا حق صرف تلاوت نہیں؛ بلکہ تدبر، تفکر، فہم اور عمل بھی ہے۔ امت کا عروج ہمیشہ قرآن سے وابستگی کے ساتھ رہا ہے اور اس کا زوال قرآن سے دوری کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے؛ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام وخواص دونوں قرآنِ کریم کے ترجمہ اور معتبر تفاسیر سے تعلق مضبوط کریں، علماء کی رہنمائی میں قرآن کو سمجھیں اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو اس کے نور سے منور کریں۔

ناچیز نے قرآنِ کریم کے ترجمہ، تفسیر، اصولِ تفسیر، تدریسِ قرآن اور متعلقہ مباحث پر بعض دیگر مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ خصوصاً ''تفسیر اور اصولِ تفسیر کی تدریس'' کے عنوان سے ایک مستقل مقالہ موجود ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند اور اس نہج پر چلنے والے مدارس کے نظامِ تدریسِ تفسیر، اس کے مناہج اور ممکنہ اصلاحات پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مزید دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُسْتَعَانُ، وَهُوَ حَسْبُنَا وَنِعْمَ الْوَكِيلُ.

* * *

موجودہ حالات میں عوامی جگہوں میں نماز

از: مولانا محمد عاصم کمال اعظمی، قاسمی

نماز ایمان کے بعد سب سے اہم عبادت ہے، جو ہر مسلمان پر دن ورات میں پانچ بار فرض ہے،عورت کے لیے نماز ادا کرنے کی سب سے بہتر جگہ اس کا گھر ہے اور مرد کے لیے سب سے بہتر جگہ مسجد ہے اور مسجد روئے زمین کی سب سے بابرکت اور روحانی ونورانی جگہ ہے، ایک حدیث میں ہے: "خَيْرُ البِقَاعِ المَسَاجِدُ"[1] مسلمان مردوں کے حق میں فرائض کی ادائیگی کے لیے سب سے عمدہ جگہ مسجد ہے؛ اسی لیے مسجد میں نماز ادا کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے اور فضیلت وثواب وارد ہوا ہے اور جو مسجد میں نماز پڑھنے پر قادر ہو اور پھر بھی مسجد میں حاضر نہ ہو تو اس کے لیے وعید اور دھمکی ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے کہ نماز صرف مسجد میں ہی ادا ہوسکتی ہے؛ بلکہ اسلامی قانون میں تمام روئے زمین سجدہ گاہ بن سکتی ہے اور زمین کے ہر خطے پر نماز ادا کی جاسکتی ہے، دنیا کے کسی خطہ اور زمین کے کسی ٹکڑے پر اہل اسلام کے لیے سجدہ ریزی میں کوئی حرج نہیں؛ چنانچہ احادیث مبارکہ میں مذکور نبوی امتیازات وخصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ساری زمین پر نماز پڑھنے اور تیمّم کرنے کی اجازت ہے؛ آپ کا ارشاد ہے: أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ من الانبياء قَبْلِي... وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ[2] مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی تھیں، (ان میں سے) میرے لیے تمام زمین کو سجدہ گاہ اور پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے،تو میری امت کے جس آدمی کو بھی نماز (کا وقت) پالے تو نماز پڑھ لے!

یہ امتیاز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی حاصل نہ تھا، ادیانِ سابقہ میں یہ پابندی تھی کہ وہ (مثلاً یہود ونصاریٰ) صرف عبادت گاہوں ہی میں نماز ادا کریں؛ جیسا کہ ایک حدیث میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وكان من قبلي يعظمون ذلك، انما كانوا يصلون في كنائسهم وبيعهم[۳]؛لیکن مذکورہ بالا حدیث کے عموم کا تقاضا ہے کہ اس زمین کا ہر جز جائے سجدہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا وہاں مسجد بنائی جاسکتی ہے اور امتِ محمدیہ کے واسطے نماز کے لیے مسجد کو لازم قرار نہیں دیا گیا؛ لہٰذا امت میں جو شخص، جس جگہ بھی نماز کا وقت پالے تو اس جگہ اس وقتیہ نماز کی ادائیگی فرض عین ہوجاتی ہے؛ تاہم ایک مسلمان کو مسجد میں ہی نماز ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے حکم اور فضیلت اسی میں ہے کہ وہ فرض نماز حتی المقدور مسجد ہی میں ادا کرے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ”من سمع النداء فلم ياته فلاصلاة له؛الامن عذر“[۴] جو شخص اذان سنتا ہے، پھر نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں نہیں آتا تو اس کی نماز نہیں ہے، ہاں اگر کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے۔

وقت پر نماز ادا کرنے کا حکم

نماز جہاں ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، وہیں نماز کے ساتھ ایک ضروری چیز یہ بھی جڑی ہوئی ہے کہ باری تعالی نے نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد ہے: اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا.[النساء:۱۰۳] ”نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیٔ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔“ یعنی ہر نماز کے لیے وقت متعین ہے اور جس نماز کے لیے جو وقت متعین ہے اسی وقت میں نماز ادا کرنا ضروری اور فرض ہے، اگر وقت سے پہلے نماز ادا کرتا ہے تو سرے سے نماز ادا ہی نہ ہوگی اور اگر نماز کا وقت نکل جانے کے بعد ادا کرتا ہے تو علماء اُمت کا اتفاق ہے کہ فرض نماز جان بوجھ کر چھوڑنا بہت بڑا گناہ ہے، حتی کہ شریعتِ اسلامیہ میں زنا کرنے، چوری کرنے اور شراب پینے سے بھی بڑا گناہ نماز کا ترک کرنا ہے۔

نیز یہ کہ کوئی شخص خواہ وطن میں مقیم ہو، یا حالتِ سفر میں ہو، مسجد موجود ہو یا مسجد موجود نہ ہو، اُسے ہر حال میں نماز ادا کرنی ہے، نماز کی معافی کی کوئی شکل نہیں ہے اور نہ کسی حال میں نماز ذمہ سے ساقط ہوگی؛ البتہ بعض صورتوں میں اس میں تخفیف ہوجاتی ہے؛ جیسے سفر میں، میدان جنگ اور حالت قتال میں، اسی طرح شدید خوف کے عالم میں بھی تخفیف ہوجاتی ہے۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ [سورة البقرة، الآية:۲۳۸]

في صحيح البخاري: عن عبد الله، قال: سألت النبي صلى الله عليه و سلم: أي العمل أحب إلى الله؟ قال:"الصلاة على وقتها"اه(۵).

"ثم لا يخفى أن تأخير العبادة عن وقتها لا يجوز(۶).

لا يعلم خلاف بين الفقهاء في أن تأخير الصلاة عن وقتها بدون عذر ذنب عظيم، لا يرفع إلا بالتوبة والندم على ما فرط من العبد، وقد سمى النبي صلى الله عليه وسلم من فعل ذلك بأنه مفرط أي مقصر، حيث قال: ليس التفريط في النوم، إنما التفريط في اليقظة"(۷).

ملکی صورت حال اور مسئلۂ نماز

ملک ہندستان ہمیشہ سے دین ومذہب اوردھرم سے وابستہ لوگوں کا ملک رہا ہے، یہاں کے خمیر میں مذہب کی روح شامل ہے،مختلف مذہب اور دھرم کے لوگ صدیوں سے اس ملک میں آباد ہیں اور جب سے وہ اس ملک میں ہیں اپنی مذہبی شناخت اوراپنے مذہب پرعمل کی آزادی کے ساتھ ہیں ، اسی طرح جب اس سرزمین نے مسلمانوں کوخوش آمدید کہا تو مسلمان بھی اپنی مذہبی تعلیمات پرعمل کے لیے آزاداورخودمختاررہے؛حتی کہ وہ کئی صدی تک اس سرزمین پرتخت وتاج کے مالک رہے،تب بھی نہ انھیں مذہبی معاملات میں کسی کی جانب سےکوئی خلل پیش آیااور نہ انھوں نے طاقت وقوت اوراقتدار واختیار کے باوجودکسی کی مذہبی آزادی چھیننے کی کوشش کی ، ہرکوئی اپنے دین ومذہب پرچلنے میں بے فکراورآزادتھا اورطریقۂ عبادات وعقائدمیں اختلاف کے باوجودایک دوسرے کے مذہبی اموراوردینی شعائرکا احترام پایا جاتا تھا؛لیکن کم نصیبی سے اس ملک پرایک ایسی تنگ ذہن قوم (انگریز) کا غلبہ ہوگیاجس نے اپنی سیاسی بقاء کے لیے نہ صرف یہاں کے مذہبی امور میں دخل اندازی کی؛ بلکہ باہم شیروشکررہنے والے مختلف ادیان ومذاہب کے لوگوں کوآپس میں لڑانے اورایک دوسرے کی نگاہ میں دشمن اورقابل نفرت بنانے کا گھناؤنا کام کیا،جس نے اس ملک کی جڑیں ہلاڈالیں،اورآج جب کہ اس ناپاک وجود سے یہ ملک پاک ہوگیا؛مگراس کے بوئے ہوئے زہریلے بیج تہِ زمین سے نکلنے لگے ہیں اورملک میں نفرت اورتناؤ کا ماحول دوبارہ شروع ہوگیا ہے اوراس کا اثرسیاسی وسماجی گلیاروں سے ہوتے ہوئےعبادت گاہوں اورعبادات وعقائدتک آپہنچا ہے اوراسی زد میں ''مسجد کے باہرنماز'' پڑھنے کا مسئلہ بھی آگیا(جہاں حالیہ چندسالوں میں عوامی مقامات

پرنماز پڑھنے کے بعض واقعات کوشہرت دے کر ایک ایساماحول بنادیا گیا گویا کہ کھلی جگہ میں نماز پڑھنا بہت بڑاعیب یا قانونی اعتبار سے بہت بڑاجرم ہے)؛جب کہ نہ صرف انگریزی حکومت میں؛ بلکہ اب سے چندسال پہلے تک مسجد کے علاوہ عوامی جگہوں میں اور دورانِ سفرنماز پڑھنے میں کسی طرح کی کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی، بس اسٹاپ، اسٹیشن، ائیر پورٹ، ہوٹل، ڈھابہ، ریسٹورنٹ اور دیگرعوامی مقامات پر بلاخوف نماز پڑھ لی جاتی تھی، مگر اب حالات بالکل بدل چکے ہیں، پبلک مقامات پرنماز پڑھنا بہت مشکل ہوگیا ہے اور ملک کی موجودہ صورت حال میں مذکورہ بالا مقامات پرنماز کی ادائگی کو کچھ شرپسندوں نے ایک متنازع مسئلہ بنادیا ہے؛جب کہ دستور اور قانون میں عوامی مقامات پر عبادت کی اجازت ہے؛خصوصاً ۱۹۹۴ء کے سپریم کورٹ کے اس آرڈر کا حوالہ موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ”نماز پڑھنے کے لیے مسجد ضروری نہیں ہے، نماز کہیں بھی پڑھی جا سکتی ہے؛ یہاں تک کہ کھلے مقامات پر بھی مسلمان نماز ادا کرسکتے ہیں“۔ (۸)

اور یہ معقول بات ہے کہ جب ہندستان ایک جمہوری ملک ہے اور ہرشہری کوجمہوریت کے قانون کے تحت اپنے مذہب پر چلنے اور عبادت کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے اپنے مذہبی رسوم ورواج کی کھلے عام، عوامی جگہوں اور بیچ راستوں پر نہ صرف ادائیگی کی اجازت ہے؛ بلکہ انھیں کسی قسم کی رکاوٹ اورکسی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے؛ حالاں کہ بعض صورتوں میں عوام اور شہریوں کے لیے خلل اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے، پھر بھی انھیں ہرطرح سے اجازت ہے تو مسلمان کو کھلے میں نماز کی اجازت نہ دینا جمہوری آئین پر سوال کھڑا کرتا ہے!

لہٰذا سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس حوالے سے بیداری لائی جائے اور یہ جائز سوال مناسب جگہوں تک پہنچایا جائے؛ ورنہ جولوگ آج نماز کو لے کر سوالات کھڑے کررہے ہیں، اُن کے طرزِعمل سے ان کے ارادوں کا پتہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ انھیں صرف عوامی جگہوں پرنماز کی ادائیگی سے اختلاف نہیں ہے کہ اگر کھلی جگہوں پرنماز ادا کرنی بند کردی جائے تو اعتراض ختم ہوجائے گا؛ بلکہ ان کی کوششیں بڑھتی جائیں گی اور ان کے دعووں اور اعتراضات کی فہرست طویل ہوتی جائے گی؛اس لیے جہاں اس ملک میں مسلمان اپنے دیگر حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے، وہیں نماز کے لیے بھی جدوجہد وقت کا اہم تقاضہ ہے اور پوری ہمت اور بیداری کے ساتھ آواز اٹھانے کی ضرورت ہے اور یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ جب مسلمان اس ملک کا باشندہ ہے تو تمام باشندگان وطن کے

ساتھ اس کو بھی ہرطرح کی مذہبی آزادی فراہم ہونی چاہیے اور جہاں اتنے لمبے لمبے پروگرام سڑکوں، چلنے کے راستوں،عوامی جگہوں پر منعقد ہوتے ہیں اوران سے عوام کوکوئی تکلیف نہیں ہے تو نماز جیسی مختصر، چندمنٹ کی پرامن،خاموش عبادت سے کسی کوکیا تکلیف ہوسکتی ہے؟

عوامی مقامات میں نماز کاحکم

اس تناظر میں سوال ہوتا ہے کہ اگرنماز کاوقت ہوجائے اوروقت کے اندرمسجدتک رسائی آسان نہ ہو،مثلاً وہ کسی ایسی جگہ ہے جہاں سے مسجداتنی دورہے کہ اگروہ نماز کے لیے جائے تونماز کاوقت نکل جائے،یاوہ سفرپرہواوراس کے لیےسفرکاسلسلہ روکنامشکل ہو؛مثلاً: جہاز،ٹرین یابس کےذریعےسفرہو،یاسفرذاتی گاڑی سےہواورنماز کےوقت میں مسجد ملنےکی امیدنہ ہواورنہ ہی منزل تک پہنچ سکتا ہوتو کیا کرے؟

آیندہ صفحات میں اس حوالہ سےشریعت کی رہنمائی اورشرعی حکم بالتفصیل بیان کیاجاتا ہے:

(۱):جب نماز کاوقت ہوجائے تووقت کے اندرنماز کاادا کرناضروری ہے،بلاوجہ اس کو موخرکرنایاقضا کرنادرست نہیں؛حتی کہ اگرایسی جگہ ہوجہاں مسجد یانماز کے لیےمناسب جگہ کانظم نہ ہوتو کوشش کادامن ہاتھ سےنہ جانے دےاور ماحول کوسازگار بنانے کی جدوجہد کرے،خصوصاً ملک کی موجودہ صورت حال میں حکمت وبصیرت سے کام لیتے ہوئے جوجگہ میسرآجائے وہاں نماز اداکرنے کی بھرپورسعی کی جائے،یہی شریعت کاحکم ہےاورقانونی اعتبارسےبھی اس کی اجازت ہے،اورپھرکوشش بھی اگردل سے ہوتوراستہ خودبخودبنتاجاتا ہے،آج بھی اللہ کے بہت سے نیک بندے ہیں جن کی دوران سفرایک بھی نماز قضانہیں ہوتی۔اوریہ بھی معلوم ہوناچاہیے کہ آج بھی ملک کابڑاطبقہ وہ ہے جوسوچ وفکرمیں معتدل اور دوسروں کے دین ومذہب کااحترام کرنے والا ہے، اگرمحبت اورسنجیدگی سے ان کاتعاون حاصل کیاجائے توامیدہے کہ وہ معاون ثابت ہوں گے۔

قال النبی صلی اللہ علیه وسلم :وایمارجل من امتی ادرکته الصلاةُ فلیصل(۹).

”والشأن فی المسلم دینا وعقلا أن یبادر إلی أداء الصلاة فی وقتها، ویأثم بتأخیرها عن وقتها بغیر عذر، کما بینا فی فضل الصلاة، لقوله تعالی: [فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ، فَأَقِيْمُوا الصَّلاةَ، إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا]، وتأخیر الصلاة من غیر

عذر معصية كبيرة لا تزول بالقضاء وحده، بل بالتوبة أو الحج بعد القضاء[10].

(۲):اگر پوری کوشش کے بعد مناسب جگہ کا نظم نہ ہوسکے اور یہ خطرہ ہوکہ اگر کسی شدت پسند اور فسادی شخص نے نماز پڑھنے کے منظر کو قید کرکے اس کو عام کردیا، یا کسی سرکاری محکمہ میں شکایت کردی تو اس سے جان ومال اور عزت کا بھاری نقصان ہوگا، ذہنی وجسمانی اذیت کا سامنا کرنا ہوگا اور پوری قوم کو سب وشتم کا نشانہ بنایا جائے گا تو (اس تصور کے ساتھ کہ دین اسلام میں کسی بھی حال میں نماز چھوڑ نا درست نہیں ہے) یہ جان لے کہ شریعت اسلامیہ نے شدید عذر اور سخت مجبوری کے وقت احتیاط کا حکم دیا ہے؛ لہٰذا اس صورت حال میں حتی الامکان ادائیگی نماز کی کوشش کے بعد اس نماز کو موخر کرنے کی اجازت ہوگی یعنی جان ومال اور عزت کے تحفظ کے پیش نظر اُس وقت اور اُس جگہ نماز ادا نہ کرے، بعد میں کسی محفوظ ومناسب جگہ، یا وطن پہنچ کر چھوٹی ہوئی نماز کی قضا کرے اور استغفار کرتے ہوئے اللہ تعالی سے امید رکھے کہ اس تاخیر صلاۃ پر عنداللہ گنہگار نہ ہوگا۔

فی الخلاصة و فتاوی قاضی خان و غيرهما:الأسير فی يد العدوإذا منعه الكافر عن الوضوء والصلاة يتيمم ويصلی بالإيماء ثم يعيد إذا خرج، وكذا لو قال لعبده:إن توضأت حبستك أو قتلتك، فإنه يصلی بالتيمم ثم يعيد كالمحبوس؛ لأن طهارة التيمم لم تظهر فی منع وجوب الإعادة، وفی التجنيس:رجل أرادأن يتوضأ فمنعه إنسان عن أن يتوضأ بوعيد،قيل: ينبغی أن يتيمم و يصلی ثم يعيد الصلاة بعد ما زال عنه؛ لأن هذا عذر جاء من قبل العباد فلا يسقط فرض الوضوء عنه اه. فعلم منه أن العذر إن كان من قبل الله تعالی لا تجب الإعادة و إن كان من قبل العبد وجبت الإعادة[11].

وفی الدرالمختار: باب قضاء الفوائت: لم يقل المتروكات ظنا بالمسلم خيرا،إذ التأخير بلا عذركبيرة لا تزول بالقضاء؛ بل بالتوبة أوالحج، ومن العذر: العدو، وخوف القابلة موت الولد لأنه عليه الصلاة والسلام أخرها يوم الخندق اه. و فی حاشية ابن عابدين: (قوله: العدو) كما إذا خاف المسافر من اللصوص أو قطاع الطريق جاز له أن يؤخر الوقتية لأنه بعذر. بحر عن الولوالجية. قلت: هذا حيث لم يمكنه فعلها أصلا، أما لو كان راكبا فيصلی على الدابة و لو هاربا، و كذا لو كان يمكنه صلاتها قاعدا أو إلی غير القبلة و كان بحيث لو قام أو استقبل يراه العدو يصلی بما قدر كما صرحوا به (قوله: يوم الخندق) و ذلك " أن المشركين شغلوا رسول الله – صلی الله عليه و سلم

– عن أربع صلوات يوم الخندق حتى ذهب من الليل ما شاء الله تعالى فأمر بلالا فأذن ثم أقام فصلى الظهر، ثم أقام فصلى العصر، ثم أقام فصلى المغرب، ثم أقام فصلى العشاء" ح عن فتح القدير(۱۲).

ومن أخر الصلاة عن وقتها لعذر مشروع فلا إثم عليه، ومن العذر: خوف العدو، وخوف القابلة موت الولد، أو خوف أمه إذا خرجه رأسه، لأنه عليه السلام أخر الصلاة يوم الخندق"(۱۳).

(۳): ایسی صورت میں جب کہ نماز ادا کرنا مشکل ہو جائے تو نماز کو بالکلیہ نہ چھوڑے؛ بلکہ اس وقت سیٹ پر بیٹھے بیٹھے، یا اپنی جگہ پر رہتے ہوئے اشاروں سے رکوع سجدہ وغیرہ کرے اور بعد میں اپنے مقام پر پہنچ کر ان نمازوں کی قضا کر لے، یہ امام محمد اور امام ابو یوسف کا مسلک ہے اور فقہ حنفی میں اسی پر فتوی ہے۔ اس کو فقہ کی اصطلاح میں ''تشبہ بالمصلین'' کہتے ہیں؛ البتہ اگر تشبہ بالمصلین بھی نہ ہو سکے تو استغفار کرے اور حالات کی تبدیلی کے لیے دعا کرے۔

(۴) غیر احناف کے نزدیک خوف اور شدید عذر کی وجہ سے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو ایک ہی وقت میں جمع کر کے (جمع حقیقی کے طور پر) پڑھا جا سکتا ہے۔

واضح ہو کہ احناف کے یہاں چوں کہ ہر نماز کا وجوب وقت کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ہر نماز کا وقت متعین ہے اور اسی میں ادا کرنا ضروری بھی ہے اور دو نمازوں کے اوقات کو حقیقت میں ایک نہیں کیا جا سکتا ہے؛ لہٰذا ایام حج میں جمع تقدیم وجمع تاخیر کے علاوہ زندگی کے کسی موڑ پر جمع حقیقی کی اجازت نہیں ہے؛ البتہ جمع صوری کی شکل اختیار کی جا سکتی ہے کہ پہلی نماز کو اس کے بالکل آخری وقت میں اور دوسری نماز کو اس کے بالکل ابتدائی وقت میں پڑھا جائے۔

ولا جمع بين صلاتين في وقت واحد في حضر ولا سفر إلا بعرفة ومزدلفة ...وما روى من الجمع محمول على الجمع الفعلي المستحب وهو تقديم الأولى لآخر وقتها وتأخير الثانية لأول وقتها(۱۴).

كما في الدر المختار: (ولا جمع بين فرضين في وقت بعذر) سفر ومطر خلافًا للشافعي، وما رواه محمول على الجمع فعلاً لا وقتًا (فإن جمع فسد لو قدم) الفرض على وقته (وحرم لو عكس) أي أخره عنه (وإن صح) بطريق القضاء (إلا لحاج بعرفة ومزدلفة) كما سيجيء.اه (۱/۳۸۱-۳۸۲)، وفي حاشية ابن عابدين: (قوله: وما رواه)

أی من الأحادیث الدالة علی التأخیر کحدیث أنس" أنه – صلی الله علیه و سلم – کان إذا عجل السیر یؤخر الظهر إلی وقت العصر فیجمع بینهما، ویؤخر المغرب حتی یجمع بینها و بین العشاء" اه[۱۵].

(۵) جہاں مسجد سے باہر نماز ادا کرنے کی نوبت ہوتو یہ دھیان رہے کہ ایسی جگہ نماز نہ پڑھے جس سے لوگوں کو تکلیف ہو؛ بلکہ کسی گوشے میں یا راستے کے کنارے ادا کرے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی الله علیه وآله وسلم نَهَی أَنْ يُصَلَّى فِي سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: فِي الْمَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، وَالْمَقْبَرَةِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وَفِي الْحَمَّامِ، وَفِيْ مَعَاطِنِ الإِبِلِ، وَفَوْقَ ظَهْرِ بَيْتِ اللهِ[۱۶]. "بے شک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سات جگہوں پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا: (۱) جہاں گوبر یعنی کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں، (۲) قصاب خانہ میں (جہاں جانوروں کو ذبح کرتے ہیں)، (۳) قبرستان میں، (۴) چلتے راستہ میں، (۵) حمام میں (نہانے کی جگہ)، (۶) اونٹوں کے باڑے میں، (۷) بیت اللہ کی چھت پر؛ لہٰذا مصروف راستے پر نماز نہ پڑھے؛ البتہ جمعہ وعیدین مستثنیٰ ہیں۔

وتکره أیضاً فی الشارع وأرض الناس کما فی الفتاوی الهندیة عن المضمرات[۱۷].

(۶): قضاء پڑھنے میں تاخیر یا سستی سے کام نہ لے؛ کیوں کہ شریعت کے مزاج میں ہر قضاء میں جلدی مطلوب ہے؛اس لیے تاخیر کے بعد جہاں کہیں اطمینان کی جگہ میسر آئے فوراً چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کرے،سفر کے مکمل ہونے یا منزل تک پہنچنے کا انتظار نہ کرے؛ ورنہ غفلت طاری ہوجائے گی اور زیادہ چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا مشکل ہوجائے گی۔

(۷): ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر دوران سفر، یا گاڑی میں کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی گنجائش نہ ہوتو اپنی جگہ اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نماز ادا کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ کیوں کہ نماز کے لیے قیام فرض ہے۔

وکذا لو اجتمعوا فی مکان ضیق لیس فیه إلا موضع یسع أن یصلی قائماً فقط یصبر ویصلی قائماً بعد الوقت کعاجز عن القیام والوضوء فی الوقت ویغلب علی ظنه القدرة بعده...... بحر ملخصاً عن التوشیح[۱۸].

خلاصہ یہ کہ ملک کے موجودہ حالات میں کھلی جگہوں اور عوامی مقامات میں یادوران سفر نماز پڑھنا پہلے جیسا آسان نہیں رہا،بعض شر پسندوں کی وجہ سے تنازع کا خدشہ رہتا ہے؛اس لیے

نمازادا کرنے میں احتیاط اورسوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا جائے اورموجودہ نازک حالات میں عوامی مقامات پراصرار کے ساتھ ایسی ہیئت میں نماز پڑھنا جس سے شرپسندوں کوموقع ملے احتیاط کیا جائے اوراحوال کے مطابق اپنی صواب دید پرعمل کرتے ہوئے حتی الوسع نمازادا کرنے کی کوشش کی جائے، ورنہ آخری درجہ یہ ہے کہ نماز کو قضا کردیا جائے؛ تاہم موجودہ حالات میں مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض اورضروری کام رجوع الی اللہ، انابت، توبہ واستغفاراوردعاوابتہال ہے؛قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے:یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ. [سورہ بقرہ:۱۵۳]''اے ایمان والو! صبراورنماز سے مدد حاصل کرو، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ ملک میں امن وامان قائم ہو، ہرشہری کواس کے جائز حقوق ملیں، بالخصوص مسلمانوں کوآزادی کے ساتھ اپنے دین وشریعت پر چلنے کا حق واختیار حاصل ہواورکسی شرپسنداورفسادی قسم کے لوگوں کے سبب کسی کی حق تلفی نہ ہو، نہ کوئی دشواری آئے اورنہ کسی مشکل کا سامنا ہو۔

***

مصادرومراجع

القرآن الکریم

(۱) الترغیب والترہیب:۱/۱۴۷، منذری، راوی:عبداللہ ابن عمر

(۲) صحیح البخاری/کتاب الصلاۃ/حدیث:۴۳۸

(۳) اخرجہ الطحاوی فی مشکل الآثار:۴۴۸۹، راوی عبداللہ ابن عمر

(۴) صحیح ابن ماجہ:۶۵۲، راوی:عبداللہ ابن عباس

(۵) صحیح البخاری: کتاب مواقیت الصلاۃ، ۱/۱۱۲

(۶) النہرالفائق شرح کنزالدقائق، کتاب الصلاۃ، باب قضاء الفوائت، ۱/۳۱۶، الناشر: دارالکتب العلمیۃ

(۷) الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، أوقات الصلوات، أوقات الکراہۃ، حکم الصلاۃ فی غیروقتہا، تأخیرالصلاۃ بلاعذر، ۷/۱۸۶، ط: دارالسلاسل

(۸) "A mosque is not an essential part of the practice of the religion of Islam and Namaz (prayer)

by Muslims can be offered anywhere, even in open."*

یہ فیصلہ 5 ججوں کی بنچ کا تھا جس کی صدارت اس وقت کے چیف جسٹس ایم .این .وینکٹاچلیہ (Chief Justice M. N. Venkatachaliah) کررہے تھے۔

'Dr. M. Ismail Faruqui v. Union of India' (1994)6SCC"360, Para 82(صفحہ نمبر414اور415)

605*SC1995*AIR*:(All India Reporter)*AIR

1 SCRSupp 5(1994)**:(سرکاری لارپورٹ-Supreme Court Reports)*SCR*

(۹) صحیح البخاری/کتاب الصلاۃ/حدیث:۴۳۸

(۱۰) الفقہ الاسلامی وادلتہ:القسم الاول العبادات،الباب الثانی الصلاۃ،الفصل التاسع،المبحث الثانی قضاء الفوائت،معنی القضاء وحکمہ شرعاً، ج:۲،ص:۱۱۴۷،ط:دارالفکر

(۱۱) البحرالرائق،کتاب الطہارۃ،باب التیمم،۱/۱۴۹،ط:دارالکتاب الإسلامی

(۱۲) حاشیۃ ردالمحتار علی الدرالمختار،کتاب الصلاۃ،باب قضاء الفوائت،۲/۶۲،ط:سعید

(۱۳) الفقہ الاسلامی وادلتہ:القسم الاول العبادات،الباب الثانی الصلاۃ،الفصل التاسع،المبحث الثانی قضاء الفوائت،معنی القضاء وحکمہ شرعاً، ج:2،ص:1147،ط:دارالفکر

(۱۴) البحرالرائق شرح کنزالدقائق،ج:2،ص:۱۴۷

(۱۵) الدرالمختارمع ردالمحتار:۱/۳۸۱

(۱۶) ترمذی،السنن،أبواب الصلاۃ،باب ماجاء فی کراہیۃ مایصلی إلیہ وفیہ،۱:۳۷۵،رقم:۳۴۶

(۱۷) الفتاوی الہندیۃ:۳/۶۲۱

(۱۸) ردالمحتار،کتاب الطھارۃ،باب التیمم،۱:۶۹۳،ط:مکتبۃ زکریا دیوبند

***

ہمارے فقیہ بننے میں رکاوٹیں

از: ڈاکٹر مفتی عبداللہ فردوس

فقہ اسلامی اُمت مسلمہ کی فکری وعملی راہ نمائی کا بنیادی ستون ہے۔ چودہویں صدی ہجری میں نوع بہ نوع نئے مسائل فقہ اسلامی کی تجدیدی خدمات نے جمود کو توڑنے کی کوشش کی؛ مگر آج بھی کئی رکاوٹیں سامنے ہیں۔ تاریخ سے واضح ہوتا ہے کہ نقصان نئی سوچ سے نہیں؛ بلکہ جمود اور بے علمی سے ہوا۔

فقیہ کی نوعیت اور مصداق کے بارے میں اختلاف ضرور ہے؛ لیکن اس کا معدوم ہونا نہیں۔ اب بھی فکری کاوشیں اور علمی وسعت کچھ کم نہیں ہے۔

فقیہ کی تعریف:

دورِ حاضر میں فقیہ کو دین شناسی کے اعلیٰ مقام پر ہونا چاہیے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے:

1- وسیع مطالعہ۔

2- جدید مسائل کے حل کی تربیت۔

3- طویل عرصے تک کسی نگران کے تحت کام کرنا۔

4- مسائل کو عقلی ونقلی استدلال کے ذریعے سمجھنا ان اوصاف کے حامل کو فقیہ کہتے ہیں۔

ائمہ مجتہدین کے بعد کم ہمتی کا منظر تیسری صدی ہجری کے آخر میں ظہور پزیر ہوا۔ مجتہد مطلق کے بعد اجتہاد میں مجتہد منتسب یا مجتہد فی المذہب کا درجہ ہے اور مجتہد فی المسائل کا دائرہ تین اصول کے تحت آتا ہے۔

1- قیاس شرعی یعنی علت کی تلاش اور تتبع۔

2- ظن اور تخمین۔

3- اصول کی بنیاد پر جزئیات تک رسائی۔

(مسئلہ اجتہاد:150،مستفاد)

اس کے بعد اہلِ علم سے اجتہاد کا لاحقہ تاریخی لحاظ سے ختم ہوا۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں فقہ،فقیہ،افقہ اور تفقہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مادہ اور معانی اگر چہ قریب قریب ہیں؛ لیکن ان کے مصداق میں فرق ضرور ہے چوں کہ شریعت کا مقصود قصداً و ارادتاً ان سے فرق مراتب کی طرف اشارہ ہے۔ اگر چہ اصولیین کے نزدیک فقیہ سے مراد مجتہد ہے۔

فقیہ کی ذمہ داری: فقیہ متبادل راستہ نکالنے میں ماہر ہوتا ہے ایک فقیہ کی صرف اتنی ہی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ فلاں چیز حرام ہے؛ بلکہ اس کا متبادل راستہ بھی بتائے گا۔ فقہائے کرام نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے امت مسلمہ کے پیش آمدہ مسائل میں ہر دور میں ٹھوس علمی کارنامے انجام دیے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ہے؛ کیوں کہ وہ خود بھی اس کے مکر و فریب سے بچتا ہے اور دوسروں کو بھی حقائق بتلا کر بچاتا ہے۔ اس کو کسی نے خوب نظم کیا ہے۔

فإن فقيها واحـــد متـــورعـــا أشد على الشيطان من ألف عابد

حضور ﷺ نے جریج نامی راہب کے بارے میں فرمایا کہ وہ بہت عابد زاہد تھا؛ لیکن فقیہ نہیں تھا اگر فقیہ ہوتا تو وہ نماز توڑ دیتا۔ شریعت کا حکم ہے کہ والدین کی مشکلوں میں پکار پر نفل کی نیت توڑ سکتے ہیں اور ان کی بات سن لے یہاں تک کہ اگر بہ ضرورت پکاریں تو فرض بھی توڑ دے۔

رکاوٹوں کے اسباب

1- متقدمین کی کتابوں سے روگردانی۔
2- کلیات کی جگہ پر جزئیات کی تعلیم دینا۔
3- جدید مسائل میں قولِ ضعیف یا دیگر فقہی مسالک سے استفادہ نہ کرنا۔
4- علوم عقلیہ ونقلیہ میں عدمِ مہارت
5- فقہی مجالس کا انعقاد نہ کرنا۔
6- جدید مسائل کا حل مشہور اداروں اور شخصیات کے ذریعہ نہ کرنا۔

7- درس نظامی میں اصولِ فقہ کو نظر انداز کرنا۔

ان امور کی طرف توجہ دینے کے جو فوائد ہیں وہ اپنی جگہ مسلّم ہیں؛ لیکن ان کی فقدان نے اجتہادی قوت کو کمزور کیا اور جدید مسائل کے حل کو مشکل بنادیا۔

1-متقدمین کی کتابوں سے روگردانی

پہلی اُمتوں کے مسائل کے حل کے لیے صرف انبیائے کرام متعین تھے۔اس اُمت کی خصوصیت ہے کہ ماہرین کو اجتہاد کی اجازت دی گئی؛ لیکن ہمارے فقیہ بننے میں یہ بھی رکاوٹیں ہیں:

1-ہمارے اور ائمہ کی کتابوں میں انقطاع؛ بلکہ پانچویں صدی تک کے ائمہ کی کتابیں وہ ہیں جو ہماری روح کو غذا پہنچاتی ہیں۔ان کی کتابیں نہ ہمارے نصاب میں شامل ہیں اور نہ مطالعہ میں رہتی ہیں۔

2-**طریقۂ تعلیم**: پہلے زمانے میں جو فقہ حاصل کرنا چاہتا تھا ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کتابُ اللہ اور سنت رسول سے مسائل کا استنباط کریں اب ہم صرف لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں۔

متقدمین کی فقہی کتابوں میں حدیث کو بہ طور استدلال اپنے مرتبہ میں رکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یا ضعیف اور متاخرین نے مذہب کی تائید کے لیے جو روایات پیش کیں تو بسا اوقات صحیح احادیث کو مرجوح اور ضعیف راجح ہوگئی ہیں؛ بلکہ اصل چیز ان کے نزدیک مذہب کی تائید ہوتی ہے اور قرآن وحدیث کو صرف استفادے تک محدود رکھا۔

جس کی وجہ سے روز بہ روز اصل مآخذ سے رشتہ کمزور ہوتا جارہا ہے اگرچہ نظریاتی طور پر اس بات کو ہم مانتے ہیں کہ فقہ اسلامی کا ماخذ قرآن وحدیث ہے؛ لیکن عملی صورت حال یہ ہے کہ عمر کا تقریباً اکثر حصّہ اصول فقہ کی فنی بحثوں اور فقہی جزئیات کے مطالعہ میں گزرتا ہے۔فقہی مجتہدات کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے۔

2-کلیات کی جگہ پر جزئیات کی تعلیم دینا

مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہونے والے امور میں سے ایک قواعد فقہیہ بھی ہے۔قواعد پڑھنے سے ملکہ فقہیہ پیدا ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر جدید مسائل کا حل آسان ہوجاتا ہے؛ تاکہ جزئیہ کے متعلق معلوم کیا جائے کہ یہ جدید مسئلہ فقہاء کے بیان کردہ قواعد فقہ میں سے کس قاعدہ کے تحت آتا ہے۔

اس لیے بعضے علماء نے کلیات پڑھنے کو قاضی اور مفتی کے لیے فرضِ عین اور عام علماء کے لیے

فرض کفایہ قرار دیا۔

تاریخِ فقہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قواعد کی فکر اور سوچ دوسری صدی ہجری کے آخر میں ظاہر ہو چکی تھی۔

اس پر بہ طور استشہاد امام کسائی اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہما اللہ کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ نحو کے مشہور امام علی بن حمزہ المعروف بہ امام کسائی متوفی 189 ھ نے امام محمد بن حسن شیبانی سے کہا: "لا أسئل عن مسئلةٍ في الفقه إلا أجبتُ عنها من قواعد النحو"۔ مجھ سے کسی فقہی مسئلہ کے بارے سوال کیا جائے تو میں اس کا جواب قواعد نحو سے دوں گا۔ پس امام محمدؒ نے ان سے کہا: ''فما تقول فيمن سها في سجود السهو هل يسجد"؟ آپ کیا کہتے ہیں ایسے آدمی کے بارے جو سجدہ سہو میں بھول گیا کیا وہ پھر سجدہ سہو کرے گا؟ تو جواب میں امام کسائی نے کہا: "لا" نہیں "لأن المُصّغر لا يُصغر"۔ کیوں کہ تصغیر کا پھر تصغیر نہیں بنایا جا سکتا''۔

قواعد کی تدوین امام محمد اور امام کسائی رحمہما اللہ نے کی، جمع اور ترتیب امام ابوطاہر دباسؒ نے کی اور تصنیفی کارنامہ امام کرخیؒ نے سر انجام دیا ہے۔

نیز الاشباہ والنظائر لابن نجیم کی شرح میں علامہ حموی نے لکھا ہے کہ ایک بار امام ابوطاہر محمد بن محمد الدباسؒ کے معاصر امام ابوسعید الہرویؒ کو معلوم ہو گیا کہ ابوطاہر الدباس نے سترہ قواعد مستنبط کیے ہیں۔

ابوسعید ہروی اس علمی راز کا پتا چلانے کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے، تحقیق کی، تو معلوم ہوا کہ امام ابوطاہر دباس نابینا ہیں؛ اس لیے وہ قواعد کو قلم بند نہیں کر سکتے ہیں۔ بھول جانے کے خطرہ کے پیشِ نظر وہ روزانہ نمازِ عشاء کے بعد جب مسجد خالی ہو جاتی ہے تو وہ اندر سے دروازہ بند کر کے ان کو زبانی دہراتے ہیں؛ ابوسعید ہرویؒ رات کو خاموشی سے مسجد میں گئے نمازِ عشاء کے بعد ایک چٹائی میں لپٹ کر بیٹھ گئے؛ امام ابوطاہرؒ نے حسبِ عادت اندر سے مسجد کا دروازہ بند کر لیا اور قواعد کو دہرانے لگے، جیسے جیسے وہ قواعد دہراتے جاتے تھے، ابوسعید بھی خاموشی سے ان کو یاد کرتے جاتے تھے؛ ابھی سات ہی تک پہنچے تھے کہ غالباً چٹائی میں لپٹنے کی وجہ سے ان کو کھانسی آ گئی، امام ابوطاہر کو پتا چل گیا کہ آج کوئی علمی سرمایہ کو اچک لینے کی غرض سے آ پہنچا ہے؛ چنانچہ انھوں نے اس کو مسجد سے باہر نکال دیا اور آئندہ کے لیے یہ معمول ختم کر دیا؛ ابوسعید ہروی نے ان سات قواعد پر اکتفا کرنے میں خیریت سمجھی۔ (الحموی ۱/۵۰، الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ: ۴/۲۸۷)

امام ابوطاہر ہی نے اس فن کی تدوین کی باضابطہ خشتِ اوّل رکھی پھر شیخ ابوالحسن عبیداللہ بن الحسین کرخی نے ''انتالیس اصول پر اصولِ کرخی'' نامی رسالہ لکھا۔امام کرخی کے بعد شیخ ابوزید دبوسی المتوفی 430ھ نے ''تاسیس النظر'' نامی کتاب لکھی،جن میں قواعد کو جمع کیا؛ان دونوں حضرات نے ان قواعد کو ''الاصل'' سے تعبیر کیا،مثلاً امام دبوسی نے فرمایا:

"الاصل عند أبی حنیفة أن المُحرم إذا أخر النسك عن الوقت الموقوت له أو قدمه لزمه دم. (تاسیس النظر،الاصل الثانی،55،تحقیق ڈاکٹر احمد محمد بیومی اور ڈاکٹر صلاح حلیمی،طبع دارالکتب بشاور)

جب محرم کسی ایسے واجب کو موخر ومقدم کرے جس کے لیے شریعت نے وقت متعین کردیا،تو اس پر دم لازم ہوگا۔

اس کے بعد بہت ساری کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں،جن میں علامہ ابن نجیم مصری کی ''الاشباہ والنظائر'' کو جامعیت کی حیثیت حاصل ہے۔یہ کتابیں اپنے موضوع پر اہم خیال کی جاتی ہیں نیز ہر مسلک کے علماء وفقہاء کی اس موضوع پر قابلِ قدر تصانیف موجود ہیں۔

3-جدید مسائل میں قولِ ضعیف یا دیگر فقہی مسالک سے استفادہ نہ کرنا

ہر دن جب آفتاب طلوع ہوتا ہے کچھ ایسے نئے پیچیدہ مسائل کے ساتھ نمودار ہوتا ہے جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ان مسائل کو فقہائے کرام ''الحوادث والنوازل'' کے نام سے اور دورِ حاضر میں ''جدید مسائل'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ان کے حل کے لیے قدم اُٹھانا ضروری ہے؛کیوں کہ ان میں سے اکثر مسائل کا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

اسلام نے احکام میں جو مکلّف ہونے کی نوعیت رکھی ہے اس کو مدنظر رکھ کر دوسرے مذاہب سے استفادے کی صورت میں مکلّف کی نوعیت خراب نہ ہوجائے۔اگرچہ آسانی مطلوب ومقصود ہے؛کیوں کہ شریعت کی رخصتوں کو اپنانا اللہ تعالیٰ کو اس طرح پسند ہے جس طرح عزیمتوں پر عمل کرنا اسے پسند ہے۔

إن اللّٰه یُحب أن توتی رخصه کما یحب أن توتی عزائمه۔(السنن الکبریٰ للبیہقی،کتاب الصلاۃ،باب کراھیۃ التقصیر :5415)

اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جائے جیسا کہ اسے یہ محبوب ہے کہ اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جائے۔لہٰذا کسی خاص فقہ کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے اگر مخصوص حالت یا افراد کو درپیش مسئلہ پر عمل کرنا دشوار ہوجائے اور دوسرے مذہب پر عمل کرنا ضرورت اور مجبوری بن جائے

تو یہ عمل جائز ہوگا؛ جیسا کہ محققین احناف نے گمشدہ شخص کی بیوی کے بارے میں امام مالکؒ کے مذہب پر فتویٰ دیا ہے کہ چار سال انتظار کرنے کے بعد نکاح فسخ کیا جائے ایسا کرنے میں اگر چہ ایک مذہب خاص کے دائرہ سے تو خروج ہوا؛ مگر دائرہ شریعت سے خروج لازم نہیں آتا؛ اس لیے کہ ''حق'' اہل السنۃ والجماعۃ کے مذاہب اربعہ کے اندر لاعلی التعیین دائر ہے اور اجتہادی مسائل وسعت کا متقاضی ہے۔

فقہائے کرام نے اجتہادی مسائل میں یہ اصول مقرر کیے ہیں:

کہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطاء'' اور دوسرے مسالک کو ''خطا محتمل الصواب'' قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ کیسا عجیب ہے کہ اس نے اختلافات کو ہماری ترقی کا زینہ بنا دیا۔

عالم اسلام میں جو فقہی اکیڈمیز نیشنل یا انٹرنیشنل لیول کی ہیں ان میں تمام فقہی مسالک سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

4-علوم عقلیہ ونقلیہ میں عدم مہارت

فقہ اسلامی استنباطی مسائل میں علوم وفنون عقلیہ ونقلیہ دونوں کو مدنظر رکھ کر جزئیات وتفریعات مرتب کرتے ہیں آج اس علمی انحطاط نے کم اور کیف دونوں کو گرا دیا۔

5-فقہی مجالس کا انعقاد نہ کرنا

وسائل کے فقدان کی وجہ سے ملک کے اہلِ علم ودانش کو جمع کرنا مشکل ضرور ہے؛ لیکن ابتدائی تشکیل ضلعے اور صوبے کے لحاظ سے ممکن ہے۔ مَالاَیُدرَکُ کُلُّه لَا یُترَک کُلُّه ممتاز علماء اور ماہرین فتویٰ کو شرکت کی دعوت دی جائے جس میں اظہار رائے کی آزادی ہر رکن کو حاصل ہو کسی کے ساتھ متفق ہونے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جائے۔

دنیا کی موجودہ صورتِ حال گزشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہے۔ دورِ اوّل میں اہلِ علم کا آپس میں ملاقات ایامِ حج میں ہوتا تھا؛ لیکن یہ ملاقاتیں محض زبانی مذاکروں تک محدود ہوتی تھیں۔ امام محمد رحمہ اللہ نے وہ مباحث قیدِ قلم میں لانے کا اہتمام کیا اور یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں عرب وعجم میں مختلف فقہی اکیڈمیز قائم ہوئیں اور وطن عزیز میں نجی فقہی مجالس کا چرچہ بھی شروع ہوا۔ الحمد للہ

نئے مسائل پہلے بھی افراد اور کمیٹیاں حل کرتے تھے اور آج بھی اس میں پیش پیش ہے اور بعد

میں بھی یہ اپنے دائرے میں قیامت تک ہوتے رہیں گے؛ لیکن اگر اجتماعیت کی شکل اور باہمی مشاورت کا باضابطہ نظم قائم کیا جائے اور امت مسلمہ کی اجتماعی راہ نمائی کا راستہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تو یہ نور علی نور ہے۔

فقہی مجالس کا انعقاد: سال میں ایک دو مرتبہ فقہی مجالس کا انعقاد کرنا اور وہ مسائل یا مسئلہ جن سے ہم دوچار ہیں، ان کو زیر بحث لانا، اس سے فقہی ذوق اور مسئلہ پر حکم لگانے کی قوت پیدا ہو جاتا ہے، جب مزید نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں تو ان کے حل کے لیے پیش رفت آسان ہو جاتی ہے یہ کام انھی فقہی مجالس کی طاقت سے حل کرنا زیادہ ممکن ہے۔

6-جدید مسائل کا حل مشہور اداروں اور شخصیات کے ذریعہ کرنا

جدید فقہی مسائل کا حل ہم نے اہم اداروں اور شخصیات کے ذریعہ روک دیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔

اس امر میں جانبین سے کوتاہی سرزد ہوتی ہیں، محقق اپنی رائے اور تحقیق کو تنقید کی ڈر سے آگے پیش نہیں کرتا، غیر مشہور ادارے اور شخصیات خواہ کتنی ہی اچھی تحقیق پیش کریں اس کو سند قبول حاصل نہیں ہوتی۔ دوسری طرف سے قلم کی سیاہی اور منبر کی آواز میں بس یہی مسئلہ اور شخص زیر بحث لایا جاتا ہے۔

7-درس نظامی میں اصولِ فقہ کے ثانوی اصول شرع کو نظر انداز کرنا

درس نظامی میں اصولِ فقہ کا جو حصہ پڑھایا جاتا ہے وہ مجتہدین کے لیے ہے اور ثانوی اصول شرع کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی کے مآخذ دو طرح کے ہیں۔ نقلی (اصلی) اور عقلی (ثانوی)۔ اصلی ماخذ میں قرآن مجید، سنتِ رسول، اجماعِ اُمت اور قیاس جب کہ عقلی ماخذ میں مصالح مرسلہ، رسم و رواج، عرف وعادت اور استصحابُ الحال وغیرہ زیر بحث آتے ہیں۔ جو عباسی دور میں سامنے آئے۔ عام کتب ِاصول فقہ میں بالعموم قرآن حکیم، سنت نبوی، اجماع اُمت اور قیاس کا ذکر ہوتا ہے۔ استحسان، استدلال، استصلاح، تعامل، عرف و عادات اور ملکی قوانین کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

متاخرین فقہاء کے مدون کردہ اصولِ فقہ کے دو حصے ہیں:

ایک حصہ تو وہ ہے جس میں الفاظ ومعانی کے اعتبار سے خاص، عام، ظاہر، خفی، عبارۃ النص، اشارۃ النص وغیرہ مباحث ذکر کی جاتی ہیں جو عموماً اصول الشاشی، نورالانوار، حسامی، توضیح وتلویح اور

عام اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور اور مدارس میں داخل نصاب ہیں۔

اس کے علاوہ اصولِ فقہ کا ایک حصہ اور بھی ہے جس میں: "ذكر بعض مالا يتجزء كله، لامساغ للاجتهاد فی موارد النص، الضرر يزال، العادة محكمة جناية العجماء جبار. إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام".

جیسے اصولی قواعد اور علت وحکمت، تداخل عبادتین فی النیۃ، عرف ورواج، تشبہ، عموم بلوی وغیرہ اصولی مباحث ہیں۔ اس موضوع پر بھی اصولیین نے کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، مثلاً علامہ ابن نجیم اور علامہ سیوطی نے "الأشباه والنظائر"، علامہ ابن القیم نے "إعلام الموقعين" میں اور علامہ شاطبی نے "الموفقات" میں انھی اصولی قواعد کو موضوع بنایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب فقاہت کا میدان گرم ہوتا ہے تو اس سے پوری قوم کی سوچ وفکر، ذہنیت، اندازِفکر، زاویۂ نظر تک بیدار ہوتے ہیں نیز ہر شخص کو یہ حق بھی نہ دیا جائے کہ وہ بہ طور خود جو چاہیے وہ کرتا رہے، اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر کام کا نہیں ہوتا۔ مختلف فقہ اکیڈمیز اس کے قابل ہے کہ ارباب نظر کو جمع کر سکیں اور علمی وفنی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی ضرورتوں کو بھی ملحوظ رکھ کر، نئے مسائل کا فیصلہ کر سکیں یہ ادارے ایسے فیصلوں کو نافذ کر سکتے ہیں۔

* * *

مسلمان اور سائنس/صحیح زاویۂ فکر

تحریر وتخریج: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

آج کل عمومی طور پر یہ تاثر عام ہے کہ سائنس ہمیں ترغیب دیتی ہے کہ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کیا جائے۔ ہر خاص و عام کی زبان سائنس کی تعریف وتوصیف میں رَطْبُ اللِّسان رہتی ہے۔ عام آدمی جب اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے تو سائنسی ایجادات ان کے دلوں پر اثر چھوڑ جاتی ہیں اور سائنس اور سائنسی ایجادات کی عظمت و بڑائی دل میں گھر کرنے لگتی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو اسکول، کالجز اور یونیورسٹیوں میں سائنس اور سائنسی ایجادات سے متعلق ہی سُننے کو ملتا ہے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے عام استعمال سے یہ صورتحال مزید گھمبیر ہوگئی ہے اور بچے بچے کی زبان پر سائنس کی عظمت چھا گئی ہے۔

مسلمان معاشروں اور بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں بعض لوگ اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ چکے ہیں اور سائنس سے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سائنس ہی ہے کہ جو ہمیں کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے اور مسلمانوں کی اصل کامیابی سائنس وٹیکنالوجی کے حصول میں ہے۔ مزِید برآں وہ اپنی اس توجیہ کے حق میں قرآنِ پاک سے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں ہی تو دراصل کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کا حکم دیا گیا ہے جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم بھی سائنسی ایجادات کریں اور پھر مسلمانوں کو نہایت شدت سے ترغیب دیتے ہیں کہ وہ بھی سائنس وٹیکنالوجی میں مغربی اقوام کی طرح ترقی کریں۔ الغرض ان جیسے حضرات کا مطمحِ نَظر یہ ہوتا ہے کہ ہر خاص و عام سائنس وٹیکنالوجی کے حصول میں اپنی زندگیاں کھپا دیں اور ایسے کرنے کا حکم خود ہمارے دین میں دیا گیا ہے۔

راقم بھی چونکہ پاکستانی معاشرے میں رہا ہے، یہیں سے بنیادی اسکول کی تعلیم سے لے کر کمپیوٹر

سسٹم انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تو راقم کے کانوں میں مختلف ذرائع سے یہ باتیں پڑتی رہیں کہ سائنس وٹیکنالوجی کا حصول ہی مقصد حیات ہے۔نعوذ باللہ! اور مسلمان ممالک کے عروج وزوال کا تعلق سائنس وٹیکنالوجی کے حصول اوراس میں ترقی سے وابسطہ ہے۔راقم پھر جب فرانس میں پی ایچ، ڈی کرنے گیا تو اپنے سائنسی شعبے میں مزید گہرائی سے مہارت حاصل کی؛البتہ یہ ضرور کوشش کی کہ کسی طریقے سے علمائے کرام کے ساتھ جڑا جائے۔اللہ پاک حضرات علمائے کرام کوجزائے خیر عطا فرمائے کہ جنہوں نے راقم کی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فرمائی اور غلط نظریات دل میں پیدا ہونے سے بچائے رکھا۔ یہ انھیں علمائے کرام کی توجہ،محنت اور دعاؤں کا اثر تھا کہ راقم غلط نظریات سے بچتا چلا گیا اوراللہ سے دعا ہے کہ راقم کا خاتمہ بھی ایمان پر ہواورایسی حالت میں ہوکہ اللہ پاک راضی ہو،آمین۔

ہمارے معاشرے میں یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ بعض لوگ سائنس اورٹیکنالوجی سے حد سے زیادہ مرعوب ہیں۔ یہ ساری کارگزاری پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قارئین کے سامنے یہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے کہ کس طریقے سے سائنس وٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات کی بڑائی ہمارے رگ وپے کا حصہ بن چکی ہے اورکس طریقے سے افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اس بارے میں صحیح نظریہ قائم کیا جائے۔اول چیز جس کی جانب اس مضمون میں راقم نے توجہ کی ہے وہ یہ ہے کہ بالکل وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا جائے کہ قرآنِ پاک میں کائنات کی تخلیق پرغور وفکر کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب ومقصد علمائے کرام نے کیا بیان فرمایا ہے اوراس کے برعکس آج کل کے جدید سائنس سے متاثرہ لوگوں نے ان آیات کوکیسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے۔

اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں سورۃ آل عمران میں اپنے خاص بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی صفات بیان کی ہیں کہ وہ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں اور کائنات کی تخلیق پرغور وفکر کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بیشک آسمانوں اورزمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں اُن عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں، (اورانھیں دیکھ کر بول اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔آپ (ایسے فضول کام سے) پاک ہیں۔پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے (سورۃ آل عمران، آیت نمبر۱۹۰-۱۹۱، آسان ترجمہ قرآن از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم)۔''

حضرت مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنیؒ مذکورہ بالا آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں عقلمند سمجھا جاتا ہے ان لوگوں نے اپنے طور پر سائنس کی معلومات میں اور دیگر امور کی معرفت حاصل کرنے میں بہت محنت کی ہے؛ لیکن ان معلومات کے ذریعہ انھوں نے خالق کائنات جل مجدہ کو نہیں پہچانا۔ ان میں بہت سے تو خالق جل مجدہ کے وجود ہی کے منکر ہیں اور جو لوگ اسے موجود مانتے ہیں، وہ بھی اس کے صفاتِ جلال و جمال کو نہیں جانتے اور اس کی تکوینی حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اس کے مظاہر قدرت سے اس کی معرفت حاصل کرنے کی بجائے، مادہ ہی کو یا طبیعت ہی کو سب کچھ مانتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ طبیعت خود ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ گئی یہ ان لوگوں کی اپنے خالق کی معرفت سے محرومی ہے، پھر انھیں یہ احساس نہیں کہ ہم کیوں پیدا ہوئے؟ اور اس دنیا کے بعد ہمارا کیا بنے گا؟ اور یہ کہ ہمارے خالق نے زندگی گزارنے کا جو نظام بھیجا ہے وہ ہم پر قبول کرنا فرض ہے، ان کے علوم اور تجربات سب اسی دنیا تک ہیں۔ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (انوارالبیان فی کشف اسرار القرآن از حضرت مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنیؒ، جلد۲، صفحہ ۱۷۰) (ترجمہ: وہ دُنیوی زندگی کے صرف ظاہری رُخ کو جانتے ہیں، اور آخرت کے بارے میں اُن کا حال یہ ہے کہ وہ اُس سے بالکل غافل ہیں (سورۃ الروم، آیت نمبر ۶، آسان ترجمہ قرآن از حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم)۔''

سورۃ آل عمران کی ان آیات کے فوائد تفسیر بیان کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین اور دیگر مصنوعات الٰہیہ میں غور و فکر وہی محمود ہوسکتا ہے جس کا نتیجہ خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو، باقی جو مادہ پرست ان مصنوعات کے تاروں میں الجھ کر رہ جائیں اور صانع کی صحیح معرفت تک نہ پہنچ سکیں، خواہ دنیا انھیں بڑا محقق اور سائنسدان کہا کرے؛ مگر قرآن کی زبان میں وہ اولوالالباب نہیں ہوسکتے؛ بلکہ پرلے درجہ کے جاہل واحمق ہیں۔''

(حوالہ: آسان بیان القرآن مع تفسیر عثمانی، سورۃ آل عمران، تسہیل و ترتیب: حضرت مولانا عمرانور بدخشانی، جلد اول، صفحہ ۴۲۷)۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ معارف القرآن میں ان آیات کی تفسیر بیان کرتے ہیں کہ عقل والوں کی پہلی نشانی یہ ہے کہ عقل والے صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر

ایمان لاتے اور ہر حال میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ:

’’آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقلمندی کا معیار سمجھ لیا ہے، وہ محض ایک دھوکا ہے، کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیدیا، کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اصلی پاور سمجھ لینے کا نام عقلمندی رکھ دیا؛ لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء ورسلؑ لے کر آئے کہ علم وحکمت کے ذریعہ سلسلہ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تمہیں سائنس نے پہونچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھو تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی، مٹی یا لوہے، تانبے کا ہے، نہ مشین کا، نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا؛ بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی اور ہوا پیدا کی، جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ تمہارے ہاتھ آئی۔‘‘

’’اس کو ایک عامیانہ محسوس مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو روک دیتی اور چلا دیتی ہے، تو علم و عقل والے اس کو احمق کہیں گے، اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں؛ بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے؛ لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کہے گا کہ انجن ڈرائیور کو پاور یا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے؛ کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم اور بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا؛ لیکن ایک فلاسفر یا سائنس دان اس کو بھی یہ کہہ کر بیوقوف بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے، جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے؛ لیکن حکمت وفلسفہ یہاں آکر تھک جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم! جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت اور پاور کا مالک سمجھ بیٹھنا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا مالک سمجھ لینا بھی تیری فلسفیانہ غلطی ہے، ایک قدم اور آگے بڑھ؛ تاکہ تجھے اس الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہاتھ آئے، اور سلسلہ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہوجائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں اور پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کیے اور یہ اسٹیم تیار ہوئی۔ اس تفصیل سے آپ نے معلوم کرلیا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف

وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور ہر وقت ہر حالت میں اس کو یاد کریں۔

پھر عقل والوں کی دوسری نشانی بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''آیت مذکورہ میں عقل والوں کی دوسری علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ آسمان وزمین کی تخلیق و پیدائش میں تفکر کرتے ہیں۔ یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ اس تفکر سے کیا مراد ہے اور اس کا کیا درجہ ہے؟ فکر اور تفکر کے لفظی معنی غور کرنے اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ہیں، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے، اسی طرح فکر بھی ایک عبادت ہے، فرق یہ ہے کہ ذکر اللہ جل شانہ کی ذات وصفات کا مطلوب ہے اور فکر وتفکر اس کی مخلوقات میں مقصود ہے؛ کیونکہ ذات وصفات الٰہیہ کی حقیقت کا ادراک انسان کی عقل سے بالاتر ہے، اس میں غور وفکر اور تدبر وتفکر بجز حیرانی کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا۔''

''بلکہ بعض اوقات حق جل شانہ کی ذات وصفات میں زیادہ غور وفکر انسان کی ناقص عقل کے لیے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے؛ اس لیے اکابر اہل معرفت کی وصیت ہے کہ ''تفکروا فی آیت اللہ ولا تتفکروا فی اللّٰہ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور وفکر کرو؛ مگر خود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں غور وفکر نہ کرو، کہ وہ تمہاری رسائی سے بالاتر ہے، آفتاب کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھا جاسکتا ہے؛ مگر خود آفتاب کو کوئی دیکھنا چاہے تو آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔''

''البتہ غور وفکر اور عقل کی دوڑ دھوپ کا میدان مخلوقات الٰہیہ ہیں، جن میں صحیح غور وفکر کا لازمی نتیجہ ان کے خالق جل شانہ کی معرفت ہے، اتنا عظیم الشان وسیع وعریض آسمان اور اس میں آفتاب و مہتاب اور دوسرے ستارے جن میں کچھ ثوابت ہیں جو دیکھنے والوں کو اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کوئی بہت آہستہ حرکت ہو تو اس کا علم پیدا کرنے والے ہی کو ہے اور انھیں ستاروں میں کچھ سیارات ہیں، جن کے دورے نظام شمسی وقمری وغیرہ کے انداز میں نہایت محکم ومضبوط قانون کے تحت مقرر اور متعین ہیں، نہ ایک سیکنڈ ادھر ہوتے ہیں نہ ان کی مشینری کا کوئی پرزہ گھستا ہے، نہ ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو کسی ورکشاپ میں بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اس کی مشینری کبھی رنگ وروغن چاہتی ہے، ہزاروں سال سے ان کے مسلسل دورے اسی نظام محکم اور معین اوقات کے ساتھ چل رہے ہیں، اسی طرح زمین کا پورا کرّہ، اس کے دریا اور پہاڑ، اور دونوں میں طرح طرح کی مخلوقات درخت اور جانور اور زمین کی تہہ میں چھپی ہوئی معدنیات، اور زمین آسمان کے درمیان چلنے والی ہوا، اور اس میں پیدا ہونے اور برسنے والی برق وباراں اور اس کے مخصوص نظام یہ سب کے سب سوچنے،

سمجھنے والے کے لیے کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتے ہیں، جو علم وحکمت اور قوت وقدرت میں سب سے بالاتر ہے، اور اسی کا نام معرفت ہے، تو یہ غور وفکر معرفت الٰہیہ کا سبب ہونے کی وجہ سے بہت بڑی عبادت ہے، اس لیے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: یعنی ایک گھڑی آیات قدرت میں غور کرنا پوری رات کی عبادت سے بہتر اور زیادہ مفید ہے۔''

''اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس غور وفکر کو افضل عبادت فرمایا ہے (ابن کثیر)۔ حسن بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، سب یہ فرماتے تھے کہ ایمان کا نور اور روشنی تفکر ہے۔ حضرت ابوسلیمان دارانیؒ نے فرمایا کہ میں گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نگاہ پڑتی ہے میں کھلی آنکھوں دیکھتا ہوں کہ اس میں میرے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس کے وجود میں میرے لیے عبرت حاصل کرنے کا سامان موجود ہے (ابن کثیر)۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ کا ارشاد ہے کہ غور وفکر ایک نور ہے جو تیرے دل میں داخل ہورہا ہے۔ حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کثرت سے غور وفکر کرے گا تو حقیقت سمجھ لے گا، اور جو سمجھ لے گا اس کو علم صحیح حاصل ہوجائے گا اور جس کو علم صحیح حاصل ہوگیا وہ ضرور عمل بھی کرے گا (ابن کثیر)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک بزرگ کا گذر ایک عابد زاہد کے پاس ہوا، جو ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے ایک طرف قبرستان تھا اور دوسری طرف گھروں کا کوڑا کباڑ وغیرہ تھا، گذرنے والے بزرگ نے کہا کہ دنیا کے دو خزانے تمہارے سامنے ہیں ایک انسانوں کا خزانہ جس کو قبرستان کہتے ہیں، دوسرا مال ودولت کا خزانہ جو فضلات اور گندگی کی صورت میں ہے، یہ دونوں خزانے عبرت کے لیے کافی ہیں (ابن کثیر)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اپنے قلب کی اصلاح ونگرانی کے لیے شہر سے باہر کسی ویرانہ کی طرف نکل جاتے تھے، اور وہاں پہنچ کر کہتے کہ تیرے بسنے والے کہاں گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے (ابن کثیر)۔ اس طرح تفکر کے ذریعہ آخرت کی یاد اپنے قلب میں مستحضر کرتے تھے۔ حضرت بشر حافیؒ نے فرمایا کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت میں تفکر کرتے تو اس کی معصیت و نافرمانی نہ کرسکتے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے ضعیف الخلقت آدمی! تو جہاں بھی ہو خدا سے ڈر اور دنیا میں ایک مہمان کی طرح بسر کر، اور مساجد کو اپنا گھر بنالے، اور اپنی آنکھوں کو خوف خدا سے رونے کا اور جسم کو صبر کا اور قلب کو تفکر کا عادی بنادے، اور کل کے رزق کی فکر نہ کر۔''

''آیت مذکورہ میں اسی فکر وتفکر کو عقلمند انسان کا اعلیٰ وصف قرار دیا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی

مخلوقات میں غور وفکر کر کے حق تعالیٰ کی معرفت اور دنیا کی ناپائیداری کا علم حضوری حاصل کر لینا افضل عبادت اور نور ایمان ہے، اسی طرح آیات الٰہیہ کو دیکھنے اور برتنے کے باوجود خود ان مخلوقات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں الجھ کر رہ جانا اوران کے ذریعہ مالک حقیقی کی معرفت حاصل نہ کرنا سخت نادانی اور ناسمجھ بچوں کی سی حرکت ہے۔''

''بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائنات عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے۔آج کی سائنٹفک اور حیرت انگیز ایجادات اور ان میں الجھ کر رہ جانے والے موجدین کی خدا تعالیٰ اور اپنے انجام کار سے غفلت حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہے کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں،اتنا ہی وہ خداشناسی اور حقیقت آ گاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں۔

بقول اکبر مرحوم ؎

بھول کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

قرآن کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے ''یعنی آسمان اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گذر جاتے ہیں ان کی حقیقت و صنعت اوران کے صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے۔''

''خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات میں غور وفکر کر کے اس کی عظمت وقدرت کا استحضار ایک اعلیٰ عبادت ہے، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کرنا سخت نادانی ہے، آیت مذکورہ کے آخری جملے نے آیات قدرت میں غور وفکر کا نتیجہ بتلایا ہے۔یعنی حق تعالیٰ کی عظیم اور غیر محصور مخلوقات میں غور وفکر کرنے والا اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے فضول و بیکار پیدا نہیں کیا ہے؛ بلکہ ان کی خلقت میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں،ان سب کو انسان کا خادم اور انسان کو مخدوم کائنات بنا کر انسان کو اس غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ ساری کائنات تو اس کے فائدہ کے لیے بنی ہے اور انسان خدا تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کے لیے پیدا ہوا ہے، یہی اس کا مقصد زندگی ہے،اس کے بعد غور وفکر اور تفکر وتدبر کے نتیجہ میں وہ لوگ اس حقیقت پر پہنچے کہ کائنات عالم فضول و بیکار پیدا نہیں کی گئی؛ بلکہ یہ سب خالق کائنات کی عظیم قدرت وحکمت کے روشن دلائل ہیں۔''

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک آنے والے انسان

وجنات کی رہنمائی کے لیے آخری نبی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا۔قرآن پاک کا مفہوم وہی معتبر اور صحیح ہوگا جو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھا ہو۔قرآن پاک کی تفسیر کا کام نہایت احتیاط کا متقاضی ہے اور ہر کس وناکس کا یہ کام نہیں کہ وہ محض قرآنی تراجم پڑھ کر عقلی طور پر قرآن پاک کی تفسیر وتشریح کرنے بیٹھ جائے۔اگر کوئی شخص محض اپنی عقل کے بل بوتے پر قرآن کا مفہوم سمجھے اور پھر اس کو منشاء الٰہی قرار دے تو اس کو قرآن دشمنی پر محمول کیا جائے گا۔نیز اگر کوئی چاہے کہ لغت کی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جائے اور اس میں الفاظ کے معنی دیکھ دیکھ کر قرآن کا مفہوم سمجھنا شروع کرے تو قیامت تک قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ لہٰذا ہم میں سے ہر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ قرآنِ پاک کی اُسی تفسیر اور مفہوم کو قبول کرے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہے۔

ہم نے اس مضمون میں قارئین کے سامنے سورۃ آل عمران کی ان آیات کا وہ مفہوم پیش کردیا ہے جو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سمجھا اور پھر حضرات مفسرین کرام نے اسے بیان فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات میں غور وفکر وہی محمود ہوسکتا ہے جس کا نتیجہ خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ ان قرآنی آیات کی من مانی تشریح کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''آج امت مسلمہ جن چیلنجز کا سامنا کررہی ہے ان میں ایک بڑا چیلنج اس علم کی روایت کا کھونا ہے جو ہم نے دمشق اور غرناطہ کے جامعات میں کھودی تھی اور آج دنیا جب ایک نئے علم کے انقلاب کی طرف گامزن ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تہذیب کہ جس کی بنیاد لفظ اقرأ پر رکھی گئی تھی وہ مختلف حوالوں سے اس شعبے میں اپنی بنیاد کھو بیٹھی ہے اور اس کے لیے ہمیں اپنی اس بنیاد تک دوبارہ پہنچنا ہوگا۔''

میں حال ہی میں اسپین گیا اور مجھے بڑی دیر سے یہ خواہش تھی کہ میں ان خطوں میں جاکر مشاہدہ کرسکوں کہ جہاں آٹھ سو سال تک اسلامی سلطنت قائم رہی، جہاں میں نے نہ صرف اسلامی سلطنت کا؛ بلکہ یورپ کا علم کے حوالے سے جسے گولڈن ایج (سنہری دور) کہا جاتا ہے اس کی بنیاد رکھی؛ لیکن پھر آٹھ سو سال کے بعد وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔اور اب وہاں پر الحمرا کا محل یا مسجد قرطبہ کی صورت میں اس دور کی علامتیں رہ گئی ہیں۔بلاشبہ اس میں بہت سبق ہے کسی بھی تہذیب کے عروج اور اس کے زوال کے لیے اور ایک کلیدی حقیقت جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تہذیب جو علم کے شعبے میں قیادت کرتی ہے اس کو دنیا میں بھی قیادت نصیب ہوتی ہے۔

یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم مسلمانوں نے دین کی اس روح کو بھلا دیا ہے اور اس میں سب سے بڑا اسبق جو ہمارے لیے ہے وہ قرآن مجید سے دوری کا ہے۔ ہم نے قرآن مجید کو تلاوت کے لیے برکت کے لیے رکھ لیا ہے؛ لیکن اس کی روح کو ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ میں اکثر اس بات پر توجہ دلاتا ہوں اپنے تعلیم اور سائنس کے شعبے سے تعلق رکھنے والوں کو کہ سورۃ آل عمران کی آیات۔ اور وہ ڈیوائن چارٹر یعنی فرمانِ الٰہی ہیں جو اس امت کو دی گئی ہیں۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت وضاحت کے ساتھ یہ بیان فرمایا کہ

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

اور پھر اپنے پیاروں کا ذکر یوں کیا کہ

''جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں کھڑے بھی بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی اور مزید غور وفکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔''

یعنی کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق پہ غور وفکر وہ ڈیوائن خدائی مشن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کے لیے نازل فرمایا یا لازم کیا کہ جو اسے یاد کرنے والے ہیں، جو اس کے پیارے ہیں، جو اس کے محبوب ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ

''اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا تو پاک ہے بس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

تو میرے بھائیو بزرگو! آج آپ مجھے بتایئے کہ کائنات کی تخلیق پہ غور وفکر کون کر رہا ہے؟ کائنات کی تخلیق کا غور وفکر جیمز ویب ٹیلی سکوپ کر رہی ہے! جو باہر مدار میں یورپ اور امریکہ کی سپیس ایجنسیوں نے لانچ کی ہے۔ آج کائنات کی غور وفکر تخلیق پر ہبل ٹیلیسکوپ کر رہی ہے کسی مسلمان ملک کا اس کے قریب قریب گزر نہیں ہے۔ جب ہمارا گولڈن پیریڈ (سنہری دور) تھا تو اس وقت ہم اسپیس سائنسز کی تحقیق کا مرکز تھے۔ تمام آبزرویٹریز یا سمرقند و بخارا میں تھیں یا اُندلس میں تھیں یا بغداد میں تھیں اور کانسٹیلیشن آف سٹارز کی میپنگ تمام مسلمان سائنس دان کرتے تھے۔ تو یہ علم اور فکر پر ہم نے جب اس روایت کو چھوڑ دیا تو ہم تنزلی کا شکار ہوتے چلے گئے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس تحقیق کی روایت کو دوبارہ زندہ کریں قرآن مجید کے ایک ایک لفظ کے اندر جو سمندر معنی کا اور ہمارے لیے دعوت عمل کا ہے ہم اس میں غوطہ زَن ہو کے اس دنیا کے اندر دوبارہ وہ شان وشوکت حاصل کریں جسے ہم بھلا چکے ہیں۔''

علمائے کرام کے مطابق قرآنِ پاک کی آیات کی مذکورہ بالا تشریح سراسر غلط ہے، ایسی تشریح

کرنے والے حضرات کو بہت سنگین خلط مبحث ہوگیا ہے، اور صحیح تشریح وہی ہے جو پہلے بیان کردی گئی۔ہم یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ نے علم کی روایت کو نہیں کھویا اور علم کی اس اصل روایت کو مدارسِ دینیہ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔یہ وہی مدارسِ دینیہ ہیں جن پر بوریہ نشین علمائے کرام نہایت محدود دنیاوی وسائل کے ساتھ اس اصل علم کی روایت کو زندہ کیے ہوئے ہیں جس کو ختم کرنے کے درپے مغربی اقوام اور باطل قوتیں ہیں۔یہ مغربی اقوام اور باطل قوتیں چاہتی ہیں کہ مدارسِ دینیہ سے اس علم کی روایت کی اصل روح کو چھین لیا جائے اور اس کے لیے مدارسِ دینیہ کے نظام کو کمزور کرنے کی کوششیں اپنے عروج پر ہیں جس کے تحت دینی وعصری علوم کا حسین امتزاج کا کھوکلا نعرہ لگایا جارہا ہے۔مدارسِ دینیہ قائم رہیں گے؛ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور باطل قوتوں کی مدارسِ دینیہ کو کمزور کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوجائے گی۔ان شاء اللہ۔

جہاں تک دمشق اور غرناطہ کے جامعات سے علم کی روایت کو جوڑنے کا تعلق ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ علم کی اصل روایت اہلِ صفہ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے زندہ کی تھی اور مدارسِ دینیہ اس علم کی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔اگر اُمت مسلمہ کو اپنی بنیاد کو پانا ہے تو ہمیں اس اصلی علم کی قدردانی کرنی ہوگی جو کہ مدارسِ دینیہ زندہ رکھے ہوئے ہیں اور جس کی بنیادیں اہلِ صفہ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے جڑتی ہیں۔

جہاں تک تعلق ہے کہ ''آج دنیا جب ایک نئے علم کے انقلاب کی طرف گامزن ہے'' تو غالبًا یہاں پر ایسے حضرات اس ''نئے علم کے انقلاب'' سے سائنس وٹیکنالوجی مراد لیتے ہیں۔اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہم مسلمانوں کو کسی ''نئے علم کے انقلاب'' کی طرف نہیں جانا ہے؛ بلکہ علم وہی محمود ہے جس کا نتیجہ خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو اور ایسے علم کا حصول متقی علمائے کرام سے حاصل کیا جاتا ہے۔

پھر کہتے ہیں کہ ''اسپین میں گئے اور وہاں جاکر مشاہدہ کیا کہ وہاں پر آٹھ سو سال تک اسلامی سلطنت قائم ہوئی''۔ہم آپ سے یہ پوچھتے ہیں کہ آپ اسپین کیوں گئے؟ آپ مدینہ منورہ کیوں نہیں تشریف لے گئے؟ آپ اہلِ صفہ کے چبوترے کا مشاہدہ کرنے کیوں گئے کہ کس طریقے سے اہلِ صفہ کئی کئی دنوں فاقوں پر فاقے سے گزارتے اور اللہ رب العزت کی معرفت اور آخرت کی تیاری کی فکر میں لگے رہتے۔کیا آپ کے سامنے حضور پاک ﷺ کا طرز زندگی نہیں؟ کیا حضور پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں ارشاد فرمایا کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور یہاں پر ایسے وقت

گزارو جیسے مسافر زندگی گزارتا ہے۔

نیز یہ جو کہا گیا کہ ''کوئی مسلمان ملک بحیثیت مجموعی کائنات کی تخلیق میں غور وفکر نہیں کررہا'' تو یہ بالکل درست ہے؛ کیونکہ ہم مسلمانوں نے اپنے اصل مقصدِ حیات کو بھلا کر ختم ہونے والی دنیاوی زندگی کے پیچھے اپنی صلاحیتیں صرف کرنا شروع کردیں ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کا تعلق ہے تو یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا معیار الگ ہے اور مغربی ممالک کی ترقی کا معیار الگ۔ بالفرض اگر مغربی سائنس وٹیکنالوجی کو ہی معیار بنالیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کس کے ذمے ہے؟ عصری تعلیمی اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں کے یا پھر مدارسِ دینیہ کے؟ سوال تو یہ ہونا چاہیے کہ جب ان یونیورسٹیوں اور عصری تعلیمی اداروں پر اتنے وسائل خرچ ہورہے ہیں تو انہی سے سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی نہ ہونے پر باز پرس بھی ہونے چاہیے؟ یہ عجیب منطق ہے کہ سائنس وٹیکنالوجی میں کام کرنے کے جو پیسے لے رہے ہیں اور جن کے یہ فرائضِ منصبی میں شامل ہے کہ وہ سائنسی تحقیق کریں، اُن سے تو کوئی باز پرس نہیں اور سائنس وٹیکنالوجی میں تحقیق کرنا جن کا کام نہیں یعنی مدارسِ دینیہ، ان سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ انھوں نے سائنس وٹیکنالوجی میں کیا کردار ادا کیا؟

مزید افسوس اس بات پر ہے کہ قرآنِ پاک کی آیات کی غلط تشریح دینی تعلیمی ادارے کے سالانہ اجتماع میں کی جارہی ہے اور کوئی بھی اس پر ان صاحب کو تنبیہ نہیں کررہا کہ کیوں وہ قرآنی آیات کی غلط تشریح کررہے ہیں۔ دینی تعلیمی اداروں میں اس طرح کی تقریر کرنے سے دو فوائد حاصل کیے جارہے ہیں، اول یہ کہ ان دینی تعلیمی اداروں کو مدارسِ دینیہ کے نظام سے علیحدہ کیا جائے اور دوم یہ کہ ان دینی تعلیمی اداروں میں کوئی اس طرح کی تقریر کرنے والوں سے باز پرس نہیں کرے گا۔ جب کہ اس کے برعکس اگر یہی تقریر عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں کی جائے گی تو وہاں کی پی ایچ، ڈی فیکلٹی ایسے لوگوں سے پوچھے گی کہ آپ سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کرنے کے لیے ہمیں فنڈنگ کیوں نہیں کررہے؟ ہماری تنخواہیں کیوں نہیں بڑھا رہے؟ ہمارے مسائل کیوں نہیں حل کررہے؟ ایسی پالیساں کیوں نہیں مرتب کررہے جن سے ملک میں سائنس وٹیکنالوجی کو فروغ ملے؟ پھر قرآنِ پاک کی غلط تشریح اتنے اعتماد سے کی جارہی ہے کہ الامان الحفیظ اور پھر علامہ اقبال کے اشعار کو بھی غلط استعمال کیا جارہا ہے۔ ہم بس گزارش کریں گے کہ خدارا قرآنِ پاک کی وہی تشریح لیں جو کہ حضرات مفسرین نے بیان فرمائی ہے اور اسی تفسیر کو اختیار کرنے میں مسلمانوں کی فلاح و

نجات ہے۔ہم قارئین کے لیے علامہ اقبال کے شعر کو دہراتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال مرحوم۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآن ہو کر

افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں کو نہ ہی ''تاریخِ سائنس'' کا علم ہے اور نہ ہی ''فلسفہ سائنس'' کا علم۔ نیز اگر آجکل کی جدید سائنس وٹیکنالوجی ہی آپ کا معیار ہے تو اس کے اندر بھی آپ جیسے لوگوں کا عالمی سطح پر کوئی مقام نہیں۔ جب آپ لوگوں کی سائنس وٹیکنالوجی میں خود ہی استعداد نہیں ہے تو آپ اپنے لوگوں کی رہنمائی کیسے کرسکیں گے؟ جب آپ کا ویژن ہی نہیں تو آپ مسلمانوں کو سائنس وٹیکنالوجی میں کیسے ترقی دلا سکتے ہیں؟ بات سیدھی سی ہے، بادی النظر میں آپ کا مقصد یہی نظر آتا ہے کہ مدارسِ دینیہ کو ان کے اصل مقصد سے ہٹایا جائے اور انھیں ''دینی وعصری علوم کے حسین امتزاج'' کے عنوان سے سائنس وٹیکنالوجی کی طرف راغب کیا جائے اور پھر نتیجتاً ان مدارسِ دینیہ کا بھی خدانخواستہ وہی حال کیا جائے جو موجودہ عصری تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کا ہے کہ پاکستان کی کوئی ایک بھی یونیورسٹی بین الاقوامی رینکنگ میں دنیا کے بیس بہترین یونیورسٹیوں میں شامل نہیں ہے۔

پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ

''آج آپ مجھے بتائیے کہ کائنات کی تخلیق پہ غور وفکر کون کررہا ہے؟ کائنات کی تخلیق کا غور وفکر جیمز ویب ٹیلی سکوپ کررہی ہے! جو باہر مدار میں یورپ اور امریکہ کی سپیس ایجنسیوں نے لانچ کی ہے۔ آج کائنات کی غور وفکر تخلیق پر ہبل ٹیلیسکوپ کررہی ہے کسی مسلمان ملک کا اس کے قریب قریب گزر نہیں ہے۔ جب ہمارا گولڈن پیریڈ (سنہری دور) تھا تو اس وقت ہم اسپیس سائنسز کی تحقیق کا مرکز تھے۔تمام آبزرویٹریز یا سمرقند و بخارا میں تھیں یا اُندلس میں تھیں یا بغداد میں تھیں اور کانسٹیلیشن آف سٹارز کی میپنگ تمام مسلمان سائنس دان کرتے تھے۔تو یہ علم اور فکر پر ہم نے جب اس روایت کو چھوڑ دیا تو ہم تنزلی کا شکار ہوتے چلے گئے۔''

ہم پہلے ہی عرض کرچکے ہیں کہ کائنات کی تخلیق پر غور وفکر کا مقصد ''خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ'' ہے۔ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ دنیا میں کتنے سائنسدان ومحققین ہیں جو کہ جدید سائنس کے تحت کائنات پر غور وفکر کرکے خدا کی یاد اور آخرت کی طرف متوجہ ہوئے؟ جدید سائنس وٹیکنالوجی

میں جو سائنسدان و محققین منہمک ہیں وہ تو خدا بیزار ہیں نعوذ باللہ۔ جدید سائنس کے تحت ان کا کائنات پر غور و فکر کچھ فائدہ مند ثابت نہیں ہو رہا، حتیٰ کہ جو مسلمان سائنسدان اور محققین ہیں، وہ بھی جدید سائنس کو پڑھ کر خدا بیزار ہو چکے ہیں الا ماشاء اللہ۔

جہاں تک مسلمانوں کے گولڈن پیریڈ (سنہری دور) کا تعلق ہے تو مسلمانوں کے لیے سنہری دور حضور پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا دور ہے اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سب سے بہترین لوگ ہیں جن کی اقتدا کی جائے۔

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''سب سے بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ جو اُن کے قریب ہوں، پھر وہ جو اُن کے قریب ہوں''۔ میرے زمانے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر دنیا سے پردہ فرمانے تک کا کل زمانہ مراد ہے، اس کے بعد اگلا زمانہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور اس کے بعد تابعین رحمہم اللہ کا زمانہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ''خیر القرون'' سے مراد اسلام کے ابتدائی تین اَدوار ہیں، رسول اللہ ﷺ کا عہدِ مبارک، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عہدِ مبارک اور تابعین کا زمانہ۔ وجہ یہ ہے کہ اس دور میں آخرت ہر رویے پر غالب تھی، اور دنیا ان کی نگاہوں میں بے حقیقت تھی، وہ دنیا طلبی، لذات و آسائش کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھے (حوالہ: دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)''۔

جب مسلمانوں کے گولڈن پیریڈ (سنہری دور) کا ذکر کیا جاتا ہے تو ماضی بَعید کے مسلمان سائنسدانوں کے نام گنوائے جاتے ہیں جن میں سرفہرست ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، فخر الدین رازی، ابونصر محمد بن محمد فارابی، ابن سینا، محمد بن موسیٰ خوارزمی، امام غزالی، اور ابن خلدون جیسے قابلِ ذکر نام ہیں۔ ان میں زیادہ تر سائنسدان طب، فلکیات، طبیعات، کیمیا، فلسفہ، علم الکائنات (کونیات)، مابعد الطبیعات، منطق، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ سائنسی علوم کے ماہر تھے اور ان میں سے کچھ کی دینی حیثیت بھی مُسَلَّم تھی جن میں امام غزالیؒ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ پھر ان ناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو ان جیسا بننا ہے اور نوجوان نسل کو اس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اصُولی بات یہ ہے کہ پہلے ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ کی عبادت ہمارا مقصد ہے یا سائنس میں زندگی کھپانا؟ ہم لوگوں کے نزدیک کامیابی کیا ہے؟ مغربی سائنسی علوم کا حصول یا اللہ کی رضا؟ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نزدیک کامیابی کا معیار کیا تھا؟ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں کتنے صحابہ سائنسدان تھے؟ صحابۂ کرام میں سے کتنے صحابۂ کرام نے دیگر

اقوامِ عالم کی زبانیں سیکھیں؟ پھر اس بات پر بھی غور کیا جائے کہ سائنس وٹیکنالوجی کے علوم کا حصول اور اس میں ترقی کرنا علمائے کرام اور مدارسِ دینیہ کا فرضِ منصبی ہے یا یونیورسٹی کے پروفیسروں اور سائنسدانوں کا؟

بعض حلقوں کی کوشش ہے کہ مدارسِ دینیہ کی ٹرانسفارمیشن کی جائے یعنی مدارسِ دینیہ کو ماڈرن یونیورسٹی بنایا جائے۔ اگر سائنس وٹیکنالوجی کا اتنا ہی شوق ہے اور مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کی خواہش ہے تو یونیورسٹیوں پر محنت کی جائے اور وہاں پر موجود سائنسدانوں اور محققین کو ترغیب دی جائے کہ وہ محنت کریں، اپنے فرائض منصبی کو نبھائیں اور سائنس وٹیکنالوجی میں مسلمانوں کا عالمی سطح پر نام روشن کریں؛ چہ جائیکہ مدارسِ دینیہ کو ان کے اصل مقصد سے ہٹایا جائے۔

ہمارے لیے معیار ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، فخر الدین رازی، ابونصر محمد بن محمد فارابی، ابن سینا، اور محمد بن موسی خوارزمی ہیں یا پھر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین؟ ہمارے لیے جابر بن حیان، ابویوسف یعقوب بن اسحاق الصباح الکندی، اور نصیر الدین طوسی معیار ہیں یا پھر امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ معیار ہیں؟ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسلمانوں کے سنہری دور کے جن سائنسدانوں کے نام گنوائے جاتے ہیں ان میں سے بعض معتزلہ، اسمٰعیلی، ملحد اور رافضی تھے؛ لہٰذا کیوں کر ایسے لوگ مسلمانوں کے پیشوا ہو سکتے ہیں؟

اس وقت سائنس کے عنوان سے جو کہا جا رہا ہے کہ مسلمان اس کو حاصل کریں تو ترقی ہوگی تو یہ محض دکھاوا ہے اور اپنے ذاتی مفادات کو حاصل کرنے کا طریقہ۔ دراصل سائنس کے حصول کے اس عنوان سے ایسے سائنسدانوں و محققین کی ایک کھیپ تیار کی گئی ہے جو کہ سرقہ بازی کے ماہر ہیں اور سائنس کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور غیر معیاری سائنسی تحقیق کر رہے ہیں اور عالمی سائنسی دنیا میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کا مقصد (مغربی طاقتوں) کا یہ ہے کہ ایسے مسلمان سائنسدان بنائے جائیں جو کہ مسلمان کے لبادہ میں ہوں اور اصل مغرب کی ایجادوں اور ایجنڈے کے سفیر ہوں۔ مثلاً مصنوعی ذہانت کو ہی لے لیجیے۔ خود عالمی مغربی سنجیدہ سائنسدان اس کی خامیوں کو جانتے ہیں؛ مگر ان مغربی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اتنا پیسہ لگایا ہے کہ اب بعض مسلمان سائنسدان آنکھیں بند کر کے، اور خصوصا کچھ نوجوان صاحبانِ علم، اس کو مدارسِ دینیہ میں اپنانے پر لگے ہیں الا ماشاء اللہ اور اصل سائنسی تحقیق کو نہیں دیکھ رہے اور صرف مغرب کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔

پھر آپ یہ کہتے ہیں کہ ''ہم مسلمان اس دنیا کے اندر دوبارہ وہ شان وشوکت حاصل کریں جسے

ہم بھلا چکے ہیں‘‘۔عرض یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہرگز ہرگز یہ مقصد نہیں ہونا چاہیے کہ اس دنیا میں شان و شوکت حاصل کی جائے۔علمائے کرام کے مطابق یہ سراسر اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے کہ انسان اس فنا ہونے والی زندگی میں اپنی صلاحیتیں صرف کردے۔ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مسلمان اللہ کے احکامات کی بجا آوری کریں گے تو اللہ پاک اس پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر فرمادیں گے،جیسا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے پوری دنیا مسخر کردی گئی تھی اور پوری دنیا ان کے تابع ہوگئی تھی۔صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین دنیا میں پھیل گئے تھے کہ اللہ کا کلمہ بلند کیا جائے،اُن کو زمین پر اقتدار نہیں چاہیے تھا،اور ان کا مقصد اللہ کی رضا تھا تو پوری زمین ان کے تابع ہوگئی،قیصر وکسریٰ کے محلات ان کی جھولی میں آگرے۔صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مقصد ہرگز دنیاوی شان وشوکت اور ان محلات کا حصول نہیں تھا۔اگر یہ محلات ہی ان کا مقصد ہوتے وہ ہرگز ہرگز وہ دنیاوی شان وشوکت کو حاصل نہ کرسکتے تھے۔اسی طریقے سے اگر آج مسلمان سائنس وٹیکنالوجی کے پیچھے بھاگیں گے تو ہم ہرگز ہرگز مغربی اقوام سے آگے نہیں نکل سکتے۔نیز مسلمانوں کے تنزل کا سبب سائنس وٹیکنالوجی میں کمی نہیں؛ بلکہ اپنا اصل مقصد کا بھولنا ہے اور مسلمانوں کا اصل مقصد ان مدارسِ دینیہ میں پڑھایا اور بتایا جاتا ہے،لہٰذا خدارا ان مدارسِ دینیہ کو ان کے اصل مقصد سے نہ ہٹائیں۔

کیا آپ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے واقعات کُتب حدیث وتاریخ میں نہیں پڑھے کہ کس طریقے سے آسمانوں کے بادل صحابہ کے حکم پر بارش برساتے تھے؟ کیا آپ نے نہیں پڑھا کہ جنگل کے خونخوار جانور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حکم پر جنگل خالی کردیتے تھے؟ کیا آپ نے نہیں پڑھا کہ ایک صحابی کے باغ میں پانی کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے دورکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی اور نتیجتاً بادل آیا اور صرف ان کے باغ پر بارش برسائی؟ الغرض،حیاۃ صحابہ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ کس طریقے سے اللہ پاک نے صحابۂ کرامؓ کے لیے اس کائنات کو مسخر فرمادیا تھا۔کیا ہم مسلمانوں کے لیے لازمی نہیں ہے کہ ہم ان صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیات کا مطالعہ کریں اور کوشش کریں کہ ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہمیشہ ہمیشہ کی آخرت کی آنے والی زندگی کی تیاری کریں!

* * *

فیمنزم اور شاہ ولی اللہ کے عمرانی افکار

از: مولانا غالب شمس
فاضل دارالعلوم دیوبند

عصری فکری منظرنامے میں مسلم معاشروں کو جن نظریاتی اور تہذیبی چیلنجز کا سامنا ہے، ان میں معاصر نسائیت (فیمنزم) اور اس کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والا تشکیکی والحادی رویہ سرفہرست ہے۔ موجودہ دور میں ارتداد اور فکری بے راہ روی کا سب سے زیادہ شکار مسلم نوجوان بالخصوص لڑکیاں ہورہی ہیں، جنھیں مساواتِ مطلق اور انفرادی خودمختاری کے دلفریب مغربی تصورات نے شدید نظریاتی الجھن میں مبتلا کردیا ہے۔ جدیدیت کی اس یلغار کا سب سے مربوط اور منظّم حملہ اسلام کے خاندانی، معاشی اور سماجی نظام پر ہوا ہے۔ اس کی سنگینی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مغرب میں ابھرنے والی یہ نسائی تحریک ابتدا میں سماجی اور معاشی مساوات کی داعی رہی، پھر اس نے بتدریج ایک باقاعدہ ''فیمنسٹ تھیولوجی'' (نسائی الٰہیات) کا روپ دھارلیا۔ بیسویں صدی کے وسط میں ویلری سیونگ اور میری ڈیلی جیسی فیمنسٹ مفکرین نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام الہامی مذاہب کی الٰہیات ''پیٹریارکی'' (پدرسری نظام) کی پروردہ ہیں۔ اس گمراہ کن تصور نے ''جیوش فیمنزم'' (یہودی نسائیت) اور ''کرسچین فیمنزم'' (عیسائی نسائیت) کو جنم دیا، جس کا بنیادی مقصد مذہبی متون میں اصلاح کے نام پر تحریف کرنا، خواتین کو مخصوص عبادات کی قیادت سونپنا اور خدا کے مذکر تصور کو مونث میں تبدیل کرنا تھا۔ جب روایتی مذاہب کے متون میں کی جانے والی یہ تانیثی تعبیرات مطلوبہ نتائج نہ دے سکیں تو بغاوت کے اس فلسفے نے ''ساٹانک فیمنزم'' (شیطانی نسائیت) کی شکل اختیار کرلی، جس میں شیطان کو حوا کا خیرخواہ اور پدرسری نظام کی حاکمیت سے نجات دہندہ بنا کر پیش کیا گیا۔

مغرب کا یہ فکری ارتقا، جب مسلم معاشروں کی طرف بڑھا تو اس نے ''اسلامک فیمنزم'' کا خوشنما لبادہ اوڑھ لیا۔ مارگوٹ بدران، اسماء برلاس، لیلیٰ احمد اور امینہ ودود جیسی فیمنسٹوں نے قرآن و

سنت کی ایسی تعبیرِنوشروع کی جومغربی صنفی مساوات کے طے کردہ فریم ورک پر پوری طرح اتر سکے۔ اس تحریک نے ریاست، سول اداروں اور روزمرہ زندگی میں صنفی مساوات کے نفاذ کے لیے نجی وعوامی شعبے کی تفریق کو یکسر مسترد کردیا۔ امینہ ودود کا نیویارک میں نمازِ جمعہ کے مخلوط اجتماع کی امامت کروانا، اسراء نعمانی کا مساجد میں صنفی اختلاط کے لیے مہم چلانا، یا فدیلا عمارہ کا حجاب کو ''خواتین کی آزادی کا کفن'' قرار دے کر اس پر پابندی کی بھرپور حمایت کرنا، دراصل اسی مغربی ایجنڈے کی کڑیاں ہیں۔ ان نسائی تحریکوں کا سب سے بڑا ہدف اسلام کا ازدواجی وعائلی نظام بنا، جس میں تعددِ ازدواج، مرد کا یک طرفہ حقِ طلاق، سرپرست (ولی) کی شرط اور وراثت میں تفاوت کو عورت کی مظلومیت اور محکومی کی علامت بنا کر پیش کیا گیا۔

جب ہم اسلام کے عمرانی ڈھانچے کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام تکمیلی مساوات اور صنفین کی حیاتیاتی جبلت پر استوار ہے۔ اس حوالے سے برصغیر کے عبقری مفکر اور متکلم، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مباحثِ ارتفاقات میں خاندانی نظام کی جو عقلی، نفسیاتی اور کلامی اساس ''تدبیرِ منزل'' کے عنوان سے فراہم کی ہے، وہ اس معاصر نسائی چیلنج کا ایک محکم اور مسکت جواب پیش کرتی ہے؛ البتہ شاہ صاحبؒ کے ان دقیق فلسفیانہ افکار کو موجودہ دور کے تناظر میں سمجھنے کے لیے برصغیر کے نامور عالم اور شارحِ حجۃ اللہ البالغۃ، مفتی سعید احمد پالنپوریؒ کی شرح ''رحمۃ اللہ الواسعۃ'' بہترین رہنما ہے۔ مفتی صاحبؒ نے عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان عمرانی، خاندانی اور نفسیاتی حکمتوں کو اس سلیس اور مدلل انداز میں واضح کیا ہے جو آج کے جدید ذہن کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا مکمل ازالہ کردیتا ہے۔

شاہ صاحبؒ اور ان کے شارح کی تفہیم کے مطابق، خاندان ایک حیاتیاتی اکائی ہے اور ''ارتفاقِ ثانی''، یعنی تمدنی ارتقا کا دوسرا اہم ترین مرحلہ اور ایک مکمل انتظامی ادارہ بھی۔ علمِ تدبیرِ منزل وہ حکمتِ عملی ہے جو ترقی یافتہ تمدن میں خاندانی تعلقات کی نگہداشت سے بحث کرتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ازدواجی زندگی کی بنیاد انسانی طبعی ضرورتوں سے جڑی ہے؛ ہم بستری کی ضرورت نے مرد وزن میں رفاقت پیدا کی اور پھر اولاد پر شفقت نے ان کی پرورش میں باہمی تعاون کی بنیاد رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت، دونوں کی فطری وجسمانی ساخت میں کچھ مخصوص کمالات اور کچھ کمزوریاں رکھی ہیں۔ عورت فطری طور پر اولاد کی پرورش کے طریقے مرد سے بہتر جانتی ہے۔ اس کی جبلت میں حیا اور خانہ نشینی کا رجحان غالب ہوتا ہے اور وہ گھریلو ولطیف کاموں میں طبعاً ماہر

ہوتی ہے۔فطری طور پر اس میں تابعداری اور موافقت کی صلاحیت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں اس کی عقلِ تدبیری، بدن اور عزم وحوصلہ نرم ہوتا ہے، جس کے باعث وہ سخت محنت اور بیرونی مشقت کے کاموں سے فطری طور پر گریزاں رہتی ہے۔اس کے برعکس مرد کی ساخت اور عقلِ تدبیری بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے زیادہ سخت اور صائب الرائے ہوتی ہے۔ مرد کی فطرت میں تسلط، مناقشے کی صلاحیت اور غیرت وحمیت کامل ہوتی ہے جو خاندان کے بیرونی تحفظ کے لیے ناگزیر ہے۔مرد میں اولاد کی پرورش کا وہ لطیف سلیقہ نہیں پایا جاتا، نہ ہی وہ ہر وقت گھر میں بند رہ سکتا ہے۔اس فطری تقسیمِ کار کی روشنی میں یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ نکاح استحصالی معاہدہ بالکل نہیں ہے؛ بلکہ دونوں اصناف کی مجبوری اور ضرورت ہے جس سے وہ ایک دوسرے کی خامیوں کی تلافی کرکے ایک پرسکون معاشرتی اکائی تشکیل دیتے ہیں۔

فیمنسٹ ڈسکورس کی جانب سے ولایت (سرپرست کی شرط) پر جو شدید اعتراض کیا جاتا ہے، شاہ صاحب اس کی نہایت شاندار عقلی توجیہ پیش کرتے ہیں۔وہ واضح کرتے ہیں کہ عورت کے معاملے میں مردوں کے اندر رقابت اور غیرت کا مادہ شدید ہوتا ہے؛ اس لیے سماجی امن کے لیے ضروری ہے کہ گواہوں اور مہر کے ذریعے نان ونفقہ کی شرط کے ساتھ مرد کا کسی عورت کے ساتھ اختصاص (خاص ہونا) برملا اور درست طریقے سے طے کر دیا جائے۔عورت چونکہ اپنے ولی کو عزیز ہوتی ہے؛ اس لیے ولی اسے ہر بیرونی دست درازی اور دھوکے سے محفوظ رکھتا ہے۔نسائی تحریکیں ولایت کو عورت کی خود مختاری کی نفی سمجھتی ہیں؛ جب کہ درحقیقت یہ ایک ایسا حفاظتی حصار ہے جس کے ذریعے پورا خاندان عورت کے حقوق کا ضامن بن جاتا ہے۔بالکل اسی طرح محرم رشتہ داروں سے نکاح کی کامل حرمت میں بھی عظیم عمرانی اور نفسیاتی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔مفتی صاحبؒ تشریح فرماتے ہیں کہ اگر محارم میں اولیاء کی رغبت کا دروازہ کھول دیا جاتا تو اس سے عورت کو ناقابلِ تلافی ضرر پہنچتا۔ولی خود عورت پر غاصبانہ قبضہ کر لیتا اور مشکل وقت یا شوہر کی حق تلفی کی صورت میں عورت کے حقوق کا مطالبہ کرنے والا پشت پناہ ادارہ (یعنی میکہ) ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔علاوہ ازیں، محارم سے نکاح کی صورت میں پیدا ہونے والے سوکنوں کے جھگڑے خونی رشتوں اور صلہ رحمی کو ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیتے۔

معاشی تفاوت اور وراثت میں عورت کے نصف حصے کو جدید دور کی فیمنسٹ مفکرین فرسودہ اور استحصالی قرار دیتے ہیں۔ان کا استدلال ہے کہ آج کی انڈیپنڈنٹ اور خود مختار عورت چونکہ معاشی میدان میں مرد کے شانہ بشانہ ہے؛ اس لیے وراثت کا یہ قانون بدلنا چاہیے۔یہ اعتراض دراصل

اسلامی معاشیات کے بنیادی ڈھانچے سے کامل ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام میں مالی تقسیم کا معیار ''جینڈر'' (صنف) ہے ہی نہیں؛ بلکہ اس کا اکلوتا معیار مالی ذمہ داری ہے۔ شاہ صاحب کے مطابق اسلام کا قانونِ نفقہ عورت کو جو مکمل معاشی تحفظ فراہم کرتا ہے، اس کی کوئی نظیر مغربی تہذیب میں نہیں ملتی۔ عورت بیٹی، بیوی یا ماں کی حیثیت میں مالی طور پر ہمیشہ کسی نہ کسی مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ عورت جو کچھ کماتی ہے، وہ اس کی خالص ذاتی ملکیت ہے جس پر خاندان کا ایک روپیہ خرچ کرنا بھی اس پر شرعاً لازم نہیں۔ اس کے برعکس، مرد پر اپنی ذات، بیوی، بچوں اور بوقتِ ضرورت دیگر غریب رشتہ داروں کا نفقہ فرض کیا گیا ہے۔ عدل وانصاف اور معاشی توازن کا یہی بے لاگ تقاضا ہے کہ جس پر مالی بوجھ زیادہ ہو، اسے وراثت میں حصہ بھی زیادہ دیا جائے۔ اگر عورت کو معاشی ذمہ داریوں سے مکمل آزاد رکھنے کے باوجود مرد کے برابر حصہ دیا جاتا تو یہ مرد پر صریح ظلم اور خاندانی اقتصادیات کی تباہی کا سبب بنتا۔ اسلام نے مرد کی جسمانی ساخت اور انہی مالی ذمہ داریوں کے سبب اسے ''قوامیت'' (خاندانی سربراہی) سونپی ہے۔ مغربی تہذیب نے جب عورت کو معاشی کفالت کے اس فطری حق سے محروم کیا تو وہاں خاندانی زندگی کا رشتہ مہر ومحبت سے خالی ہو کر ایک کچے دھاگے کا سا رہ گیا۔

قانونی اور سماجی مساوات کے حوالے سے عورت کی آدھی گواہی پر بھی معاصر لبرل اور نسائی حلقوں میں مستقل طعن وتشنیع کی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں عورت کی جبلت کے لیے "أخفهما عقلاً" (عقلِ تدبیری میں ہلکا ہونا) اور "أكثرهما انحجاماً من المشاق" (مشقتوں میں پیچھے رہ جانا) کی جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، ان اصطلاحات، یا احادیث میں وارد ہونے والے لفظ ''ناقصات عقل'' سے مراد انسانی شرف، فہم، یادداشت یا ''آئی کیو'' (ذہنی استطاعت) کی کمی ہرگز نہیں ہے؛ بلکہ اس سے مراد ''عقلِ تدبیری وتجارتی'' ہے، جس کا تعلق خالصتاً بیرونی معاملات، کاروباری جوڑ توڑ اور عدالتی محاذ آرائی سے ہے۔ مالی وتجارتی تنازعات میں عورت کی گواہی کو نصف کرنا اس کی تحقیر نہیں ہے؛ بلکہ اس کی فطری جبلت، لطافتِ مزاج اور ''امومہ'' (ممتا) کے تقدس کا پاس رکھنا ہے؛ تاکہ عدالتی جرح اور کارروائیوں کے دوران اس پر نفسیاتی بوجھ نہ پڑے۔ ایک عورت کی بھول چوک پر دوسری کا اسے یاد دلانا اسی اعصابی ونفسیاتی تحفظ کا ایک لازمی اور مشفقانہ حصہ ہے۔ اسی بنیاد پر امامتِ صغریٰ وکبریٰ (ریاست کی سربراہی اور مخلوط مجمع کی امامت) عورت کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہیں؛ کیونکہ یہ امور عورت کی فطری حیا اور تدبیرِ منزل کے اصل دائرے سے براہِ راست متصادم ہیں۔ اسلام کے احکامِ حجاب عورت کی سماجی پاکیزگی کو برقرار رکھنے اور معاشرے کو

اخلاقی انارکی سے بچانے کا بنیادی ستون ہیں، جسمانی خودمختاری پر قدغن لگانا مقصود نہیں ہے۔

خاندانی تنازعات اور طلاق کے حوالے سے بھی اسلام کا موقف مکمل عدل پر مبنی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ مرد پر خاندان کی کفالت کا بوجھ ہے؛ اس لیے طلاق کا اختیار بنیادی طور پر اسے دیا گیا ہے؛ تاکہ وہ نکاح ٹوٹنے کے مالی نقصان کے پیشِ نظر جذباتی اور عجلت پسندانہ فیصلوں سے گریز کرے۔ دوسری جانب عورت کو ''خلع'' کا حق دے کر مضبوط عدالتی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ طلاق یا وفات کے بعد عدت کی پابندی ''استبراءِ رحم'' اور نسب کی حفاظت کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے؛ تاکہ نسب کا تقدس خلط ملط ہونے سے بچ جائے۔ تعددِ ازدواج کو تنقید کا نشانہ بنانے والے مغربی مفکرین فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ مرد کا کوئی بے مہار حق نہیں ہے، یہ سنگین سماجی مسائل کا ایک تدارک اور حل ہے۔ جنگوں اور آفات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیواؤں، یتیموں اور بے سہارا خواتین کے معاشی اور جنسی تحفظ کا اس سے بہتر اخلاقی راستہ کوئی نہیں۔ مغربی معاشرے نے جب اس پاکیزہ قانونی حل کو رد کیا، تو اسے ناگزیر طور پر مسٹریس کلچر (خفیہ داشتہ کی روایت) کی غلاظت میں پناہ لینی پڑی۔ اسی طرح گھریلو معاملات میں سورۂ نساء کی آیت ''ضرب'' کو گھریلو تشدد کے شرعی جواز کے طور پر پیش کرنا فیمنسٹ طبقے کی ایک اور بڑی فکری خیانت ہے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک چونکہ خاندان ایک انتظامی ادارہ ہے؛ اس لیے اس کے نظم وضبط کو قائم رکھنے کے لیے ناظم کے پاس تادیبی اختیارات کا ہونا لازم ہے۔ قرآن نے خاندانی بکھراؤ کو روکنے کے لیے ایک نفسیاتی علاج تجویز کیا ہے، جس میں افہام وتفہیم اور بستر الگ کرنے کے بعد آخری مرحلہ ایک علامتی ضرب ہے۔ احادیثِ مبارکہ کی صراحت کے مطابق یہ ضرب غیر مبرح ہے، جس سے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے، اور چہرے پر نہ مارا جائے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ اسوۂ حسنہ تاریخ کے صفحات پر روشن ہے کہ آپ ﷺ نے پوری زندگی کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامک فیمنزم کا دعویٰ سرتاسر باطل اور فکری تضادات کا ملغوبہ ہے۔ فیمنسٹ تھیولوجی دراصل الہامی متون کو مسخ کر کے، اور اصلاحِ مذہب کا مغربی لبادہ اوڑھ کر، فرد کو خاندان کے حصار سے نکال کر تنہا اور مادر پدر آزاد کرنے کا ایک استعماری پروجیکٹ ہے؛ جب کہ اسلامی فقہ اور قوانین خالقِ کائنات کے وضع کردہ عدلِ تکمیلی کے کامل عکاس ہیں۔

* * *

سیرتِ نبوی ﷺ اور سائبر اخلاقیات

از: مولانا فضیل اختر قاسمی بھیروی
خادم التدریس دارالعلوم رحیمیہ پیلیر آندھرا پردیش

انسانی تاریخ کے ہر دور میں ذرائعِ ابلاغ نے معاشروں کی تعمیر وتشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ دور میں انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت (AI)، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور فوری پیغام رسانی کے وسائل نے دنیا کو ایک ایسی عالمی بستی میں تبدیل کر دیا ہے جہاں چند سیکنڈ کے اندر ایک خبر، تصویر، ویڈیو یا تحریر لاکھوں افراد تک پہنچ جاتی ہے۔ اس غیر معمولی سہولت نے جہاں علم، دعوت، تعلیم اور باہمی روابط کے بے شمار راستے کھولے ہیں، وہیں اخلاقی انحطاط، جھوٹی خبروں کی اشاعت، کردار کشی، تہمت، غیبت، بدزبانی، پرائیویسی کی پامالی اور نفرت انگیز مہمات جیسے شدید خطرات بھی پیدا کیے ہیں۔ یہی وہ میدان ہے جسے سائبر اخلاقیات کہا جاتا ہے۔

اسلام کا تصورِ اخلاق کسی خاص زمانے یا وسیلے تک محدود نہیں۔ اسلام انسان کو ہر حال میں سچائی، دیانت، عدل، امانت اور زبان وقلم کی پاکیزگی کا پابند بناتا ہے۔ ذرائع بدل سکتے ہیں، انسان کی اخلاقی ذمہ داریاں نہیں بدلتیں۔ اگر زبان سے ادا کیا گیا ایک لفظ قابلِ مواخذہ ہے، تو کی بورڈ سے لکھا گیا جملہ اور سوشل میڈیا پر کی گئی اشاعت بھی بارگاہِ الٰہی میں جواب دہی سے خارج نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے بشریت کو ایسا اخلاقی ضابطہ عطا فرمایا جو ہر عہد کے نئے حالات پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ اگرچہ سائبر دنیا کا وجود عہدِ نبوی میں نہیں تھا؛ مگر اس دنیا میں پیش آنے والے ہر اخلاقی مسئلے کی بنیاد انسانی کردار سے متعلق ہے اور انسانی کردار کی کامل تربیت سیرتِ نبوی ﷺ کا نمایاں وصف ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

''یقیناً آپ بلندترین اخلاق پر فائز ہیں۔'' (سورۃ القلم:4)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا:

''كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ''

''آپ ﷺ کا اخلاق سراپا قرآن تھا۔'' (صحیح مسلم:746)

علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے:

کی محمد ﷺ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

سائبر اخلاقیات سے مراد وہ اخلاقی اصول اور ضابطے ہیں جو انٹرنیٹ اور الیکٹرانک ذرائع کے استعمال میں انسان کے رویے کو درست سمت عطا کریں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی بنیاد قرآن و سنت میں موجود ہے۔ پہلے زبان اور مجلس کے ذریعے معاملات انجام پاتے تھے، آج یہی امور کمپیوٹر اور موبائل کے ذریعے انجام پا رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے انسان کو اپنے ہر قول و فعل پر باخبر رہنے کی ہدایت فرمائی ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾

''انسان جو بات بھی زبان سے نکالتا ہے، اس پر ایک نگران فرشتہ موجود ہوتا ہے۔'' (سورۃ ق:18)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ

''جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو، وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔'' (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

یہ فرمان ڈیجیٹل دنیا میں ہر پوسٹ، تبصرے اور پیغامات کی اشاعت کے لیے ایک زریں اصول پیش کرتا ہے۔

خبر کی صحت اور ابلاغ کی ذمہ داری پر سیرتِ نبوی ﷺ نے سخت تاکید فرمائی ہے۔ غیر مصدقہ معلومات کو آگے بڑھانے سے منع کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

"كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ"

''آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات آگے بیان کرتا پھرے۔'' (صحیح مسلم)

قرآنِ کریم کا بھی یہی حکم ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا﴾

''اے ایمان والو! اگر کوئی نافرمان تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو۔'' (سورۃ الحجرات:6)

سائبر فضا میں کسی کی ذات کو نشانہ بنانا، نجی زندگی کا افشا کرنا، تمسخر اڑانا اور تحقیر آمیز تبصرے کرنا انسانی وقار کے منافی ہے۔ اسلام نے انسانی احترام کو اعلیٰ مقام دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾

''اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔'' (سورۃ الحجرات:11)

نبی اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

"إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ"

''تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے۔'' (صحیح بخاری:1739، صحیح مسلم:1679)

دوسروں کے عیوب کی تلاش اور رازداری کی پامالی کے حوالے سے قرآنی ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَجَسَّسُوا﴾

''اور ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو۔'' (سورۃ الحجرات:12)

نبی کریم ﷺ نے اس رویے سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ ... لَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ تَتَبَّعَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ.

...''مسلمانوں کے عیوب تلاش نہ کرو، اس لیے کہ جو اپنے بھائی کے عیوب تلاش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے عیوب ظاہر فرما دیتے ہیں۔'' (سنن ابی داود: 4880)

آن لائن بحث ومباحثے کے دوران اخلاقی شائستگی قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مخالفین سے بھی ہمیشہ وقار اور نرمی کے ساتھ گفتگو فرمائی۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ﴾

''اللہ کی رحمت ہی کے سبب آپ ان کے لیے نرم مزاج بن گئے۔'' (سورۃ آل عمران: 159)

ڈیجیٹل وسائل جہاں خطرات رکھتے ہیں، وہیں یہ دعوت و اصلاح کا وسیع میدان بھی فراہم کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے بازاروں، حج کے اجتماعات اور سلاطین کو مکتوبات کے ذریعے دین پہنچایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر عہد کے جائز ذرائع کو خیر کے فروغ کے لیے استعمال کرنا سنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت، عمدہ نصیحت اور بہترین انداز سے دعوت دیجیے۔'' (سورۃ النحل: 125)

دعوتی کاوشوں میں آسانی اور خیرخواہی کا پہلو غالب رہنا چاہیے، جیسے کہ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

''يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا''

''آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو، خوش خبری دو اور نفرت پیدا نہ کرو۔'' (صحیح بخاری: 69، صحیح مسلم: 1734)

علمی امانت کو ملحوظ رکھنا اور نقل و اشاعت میں دیانت داری برتنا لازمی دینی امر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

''حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔'' (سورۃ البقرۃ: 42)

اسی طرح انٹرنیٹ پر وقت کی قدر و قیمت کا احساس بھی ضروری ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ"

''دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں بہت سے لوگ خسارے میں رہتے ہیں: صحت اور فراغت۔''

(صحیح بخاری:6412)

سیرتِ نبوی ﷺ سے رہنمائی حاصل کر کے جب سچائی، دیانت، عزتِ انسان، رازداری اور حسنِ گفتگو کو ڈیجیٹل زندگی کا حصہ بنایا جائے گا تو جدید ٹیکنالوجی معاشرتی اصلاح اور خیر کی اشاعت کا مضبوط ذریعہ ثابت ہوگی۔

علامہ اقبال نے انسانیت کی رہبری اور فکری بیداری کا پیغام دیتے ہوئے کہا تھا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

* * *

دعوت وتبلیغ کے نبوی اصول

از: ڈاکٹر فہد انوار
مدرس کلیۃ العلوم الاسلامیہ سواں گارڈن اسلام آباد

نبی کریم ﷺ کی دعوت کی ایک انفرادی خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ نے اپنے رفقاء کو بھی اس فریضے کی ادائیگی میں شامل کیا۔ جو اہلِ سعادت آپ ﷺ پر ایمان لاتے، وہ مستقل مبلغ ہوتے۔ وہ اپنے آقا کی تعلیمات پھیلانے میں عزیمت کا مظاہرہ کرتے تھے؛ چونکہ نبوت ووحی کا سلسلہ سرکارِ دوعالم پر بند ہورہا تھا، لہٰذا امت کے سامنے سرکارِ دوعالم ﷺ اور دعوت الی اللہ کے اصول کو منظّم انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں حضور اقدس ﷺ کو جس ضابطے کا پابند کیا گیا، اس کا بیان سورۃ نحل میں ہے:

"ادْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" (النحل:125)

''آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین) کی طرف (لوگوں کو) علم کی باتوں کے ذریعے سے) جن سے مقصود ترغیب وترہیب اور ترقیقِ قلب ہوتا ہے) بلائیے۔ اور اگر بحث آن پڑے تو ان کے ساتھ اچھے طریقے سے (کہ جس میں شدت اور خشونت نہ ہو) بحث کیجیے۔'' (بیان القرآن)

دعوت وتبلیغ کے ان تین اصولوں کو حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت کے مختلف واقعات میں بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے۔ ان اساسی اصولوں پر اٹھائے جانے والی دعوت کے اثرات کا اندازہ تیئس سال کے مختصر عرصے میں تیار ہونے والی اطرافِ عالم کے باشندگان پر مشتمل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت کی زندگیوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ دعوت وتبلیغ کے ان اصولوں کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کو تلقین کردہ مزید اصولِ دعوتِ دین بھی ملتے ہیں۔ جیسے نرم گفتاری (قول لیّن) شفقت (رِفق) تدریج، تالیفِ قلوب، اعراض، تبشیر (خوش خبری دینا) تنذیر (ڈرانا)۔ آیئے! نبی کریم

ﷺ کی سیرت میں ان اصولوں کو دیکھتے ہیں؛ تاکہ ان کے استعمال اور اثرات سے آگاہی ہو۔

حکمت

حکمت یعنی دانائی ایک عطیہٴ ربّانی ہے، جسے حکمت عطا کی گئی، اسے بڑی خیر دی گئی۔ (قرآن)

حکمت آدمی کو موقع محل کی مناسبت سے درست فیصلے میں مدد دیتی ہے۔ دعوت وتبلیغ میں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوسرے شخص کے مزاج، مذاق اور ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے اس طرزِ تکلم کو اختیار کرے، جو اس کے لیے پُراثر اور دل نشین ہو۔ اس کے ذہن سے آگے کی یا نچلی سطح کی باتیں حکمت کے خلاف ہیں۔ جو دلائل مخاطب کو قائل کرسکیں، حکمت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے والد حضرت حصین رضی اللہ عنہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ وہ شخص تھے، جن کی قریش تعظیم کرتے تھے۔ انھوں نے یہ کہہ کر حصین رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ آپ اس آدمی (محمد ﷺ) سے بات کیجیے، جو ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ حصین رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم کتنے معبودوں کی عبادت کرتے ہو؟ حصین رضی اللہ عنہ بولے: سات آسمانوں میں اور ایک زمین میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تمھیں تکلیف پہنچے تو کس کو پکارتے ہو؟ بولے، آسمان والے کو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مال ہلاک ہوجائے تو کس کو پکارتے ہو؟ بولے: آسمان والے کو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ عجیب بات ہے کہ تمہاری بات پر وہ اکیلا فریادرسی کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ اور خداؤں کو شریک کرتے ہو۔ کیا تم آسمان والے خدا کی رضا واجازت سے ان دیوتاؤں کو شریک کرتے ہو یا ان دیوتاؤں سے ڈرتے ہو کہ تم اگر ان کو شریک نہیں کروگے تو وہ تم پر غالب آجائیں گے۔ حصین بولے: ان دو میں سے کوئی بات نہیں۔ نبی کریم ﷺ کی اس حکیمانہ دعوت کا اثر یہ ہوا کہ حصین رضی اللہ عنہ اس مجلس سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے۔ (حیاۃ الصحابہ)

موعظہٴ حسنہ

یعنی عمدہ نصیحت دعوت وتبلیغ کا دوسرا بنیادی اصول ہے۔ داعی کو اپنی دعوت سمجھانے کے لیے مخلصانہ طور پر بات کرنی پڑتی ہے، جو دوسرے کے لیے دعوت کو پرکشش بنادے۔ اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کی سیرت میں وافر رہنمائی موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ بے لوث ہوکر جو دعوت دیتے رہے، وہ بت پرستوں کے لیے اجنبی تھی؛ لیکن آپ ﷺ نے اپنی دعوت کو حسین اور خوب صورت انداز میں

پیش کیا، جس نے دلوں کے اندر جگہ پکڑ لی؛ چنانچہ آپ ﷺ نے کہیں تو نفیس مثالیں دیں، کہیں ترغیب دی اور کہیں ترہیب (ڈرانے) کا پہلو اختیار کیا۔ آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت اور خیرخواہی پر مبنی نصیحت نے لوگوں کو رسولِ پاک ﷺ کی بات سننے اور ماننے پر آمادہ کر دیا۔ اب سیرتِ طیبہ میں اس کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

ضماد ازدی رضی اللہ عنہ اپنے قبولِ اسلام کا قصہ سناتے ہیں کہ میں عمرے کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوا۔ مجھے ایک مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا، جس میں ابوجہل اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا کہ اس شخص نے ہماری جماعت میں تفرقہ پیدا کر دیا اور ہمیں بے وقوف قرار دیا۔ ہمارے مردوں کو گمراہ کہا اور ہمارے معبودوں میں عیب نکالے۔ اس پر امیّہ بن خلف نے کہا کہ یہ شخص یقیناً پاگل ہے۔ ضماد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے جی میں کہا کہ میں جنات کے اثرات کا علاج کرتا ہوں، لہٰذا اس شخص سے مل کر دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد میں نبی کریم ﷺ کی تلاش میں رہا تو آپ ﷺ کو بیت اللہ میں نماز پڑھتے دیکھا۔ میں آپ ﷺ کے قریب ہوا اور بتایا کہ میں نے آپ کی قوم کو آپ کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہوئے سنا ہے، اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا علاج کروں؟ نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں یہ کلمات فرمائے:

"الحمد لله أحمده وأستعينه وأومن به وأتوكل عليه، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له واشهد ان لّا اله الااللّٰهُ وحده لاشريك له واشهد ان محمدًا عبدُه ورسولُه."

ترجمہ: "سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اسی سے مدد طلب کرتا ہوں، اسی پر ایمان لاتا ہوں اور اسی پر توکل کرتا ہوں۔ جسے اللہ ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کرے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

ضماد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے بہتر کلام کبھی نہیں سنا تھا۔ میں نے آپ ﷺ سے دوبارہ یہ کلمات پڑھنے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے اعادہ فرمایا۔ میں نے پوچھا: آپ کس چیز کی طرف بلاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی طرف کہ تم اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لاؤ اور بتوں کا پھندا پھینک دو اور میرے رسول ہونے کی گواہی دو۔ ضماد کہتے ہیں: اگر میں ایسا کروں تو میرے

لیے کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جنت! چنانچہ ضماد نے اسلام قبول کرلیا۔(حیاۃ الصحابہ)

مجادلہ

کبھی حکیمانہ دعوت اور اچھی نصیحت کے باوجود مخاطب دعوت قبول کرنے میں پس وپیش کرتا ہے اور تنقید کا رویہ اختیار کرتا ہے۔اپنے نظریات کو درست سمجھتے ہوئے دوسرے سے بحث ومباحثہ اختیار کرتا ہے۔ایسے وقت جب مباحثہ ناگزیر ہوجاتا ہے، تب دعوت کا تیسرا اصول رہنمائی کرتا ہے۔یعنی اس جدال ومباحثے میں بھی اخلاق کا پہلو ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ہدایت عطا کرنے والی اور دلوں کو پلٹنے والی ذات حق تعالیٰ کی ہے۔لہٰذا زیادہ غم و غصے کی ضرورت نہیں۔اپنا کام تو منشائے خداوندی پورا کرنا ہے۔لہٰذا داعی اپنی ذمہ داری پوری کر کے نتیجہ اللہ تعالیٰ شانہ پر چھوڑ دے۔بہرحال نبی کریم ﷺ نے ”وجادلهم بالتي هي أحسن“ پر کیسے عمل کیا، ملاحظہ ہو۔

عدیؓ بن حاتم عرب کے معروف سخی حاتم طائی کے فرزند تھے اور نصرانی مذہب کے عالم تھے۔ حضوراکرم ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے عدی بن حاتم! تُو کس چیز سے فرار ہوتا ہے؟ کیا تو اس بات سے بھاگ کہ لا الٰہ کہنا پڑتا ہے؟ تو بتا کیا اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق ہے؟ تو کس چیز سے بھاگتا ہے؟ کیا اس لیے بھاگ کہ اللہ اکبر کہا جائے گا؟ تو بتا کوئی چیز ایسی ہے، جو اللہ عز وجل سے بڑی ہے؟ عدی کہتے ہیں؛ میں مسلمان ہوگیا۔میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک جن پر غضب ہوا، وہ یہودی ہیں اور جو گمراہ ہوئے وہ عیسائی ہیں۔(مسند احمد 37،4)

قولِ لیّن

یعنی نرم گفتگو دعوت کی تاثیر اور کشش میں ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہے۔خود مالکِ ارض وسما، نے اپنے پیغمبروں کو نرم گفتگو کی تلقین کی ہے۔موسیٰ وہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے باغی اور دشمن کی طرف بھیجتے ہوئے فرمایا: ”فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَيِّنًا“ اس سے نرم بات کہنا۔اپنے حبیب ﷺ کو نرم گفتگو اور خوش اخلاقی سے مزین فرمایا اور فرمایا کہ اگر آپ تندخو اور سخت طبیعت کے ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہوجاتے۔(آل عمران،159)

نبی کریم ﷺ نے اپنے مخاطبین سے نرم گفتگو کا رویہ ہی اختیار فرمایا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ بنونجار کے ایک آدمی کے پاس عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے ماموں جان! آپ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیں۔انھوں نے کہا: میں ماموں

ہوں یا چچا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ چچا نہیں ماموں ہیں۔(یعنی رشتے کے) لا الٰہ اللہ پڑھ لیں۔ انھوں نے کہا: کیا یہ میرے لیے بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! (مسند احمد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے ایک آدمی سے فرمایا: مسلمان ہو جاؤ، سلامتی پا لو گے۔اس نے کہا: میرا دل نہیں چاہتا۔آپ ﷺ نے فرمایا: دل نہ چاہے، تب بھی (مسلمان ہو جاؤ)۔(مسند احمد)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تو آپ ﷺ نے ان کے دل پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: مسلمان ہو جائیں، سلامتی پا لیں گے؛ چنانچہ ابو قحافہ مسلمان ہو گئے۔(ابن سعد 1 / 451)

تدریج

عموماً انسانی طبائع کو کسی نئی چیز سے مانوس ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔پھر وہ نئی چیز اگر ایک ایسا نظامِ حیات اور فکر و عمل کا مجموعہ ہو، جو سر سے پیر تک ظاہر و باطن کی تبدیلی چاہتا ہو۔ان روایت و اقدار سے یکسر مختلف ہو، جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی ہوں تو اس سے انسیت بطریقِ اولیٰ دیر طلب ہوگی۔نبی کریم ﷺ نے بت پرستی اور مادہ پرستی میں ڈوبے ہوؤں کے درمیان توحید کی دعوت دی تو لوگوں کا یہ بھی اعتراض تھا کہ ہمارے آباء نے اس عقیدے کے ساتھ زندگی نہیں گزاری۔کیا انھیں عقل نہیں تھی؟ پھر صرف عقیدے کی حد تک نہیں؛ بلکہ اسلام تو ظاہر و باطن سب کی تبدیلی کا طلب گار تھا۔بقول اقبال ؎

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ایسے وقت میں ایک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ہی حوصلہ تھا، جنہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق و اعانت میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی؛ لیکن عام طور پر لوگوں کو اجنبیت محسوس ہوئی۔اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اسلامی احکام کا نزول بتدریج ہوا۔ابتداء میں توحید و رسالت اور آخرت پر پختہ یقین بٹھایا گیا۔پھر مدنی زندگی میں جمعہ، روزہ، زکوٰۃ، پردہ، حج، جہاد اور حرمتِ شراب وغیرہ کے احکامات نازل ہوتے رہے۔نبی کریم ﷺ نے اس اصولِ تدریج کو کیسے ملحوظ رکھا؟ ملاحظہ فرمائیں:

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ

فرماتے ہوئے وصیت کی کہ تم اہل کتاب پر جاؤ گے۔ جب تم ان کے پاس پہنچو تو اس بات کی دعوت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ اس میں تیری اطاعت کریں تو انھیں خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بھی مان جائیں تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے۔ جو ان کے مالداروں سے لیا جاتا ہے اور ان کے فقیروں پر لوٹایا جاتا ہے۔ اگر وہ تیری بات مان لیں تو پھر ان کے بہترین مال لینے سے بچنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا؛ کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ (البدایۃ والنھایۃ: 5،116، داراحیاء التراث)

رِفق (شفقت ومہربانی)

عام مشاہدہ ہے کہ محبت آمیز رویہ اور مشفقانہ حسنِ سلوک بڑے سخت دلوں کو بھی پسیج دیتا ہے۔ آدمی احسان کرنے والے کی بات سننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور مہربان کے لیے اس کی طبعی ضد وانا کم پڑ جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ تو دونوں جہانوں کے لیے رحمت تھے۔ مومنین کے لیے رؤف ورحیم اور لوگوں کی ہدایت پر حریص تھے۔ آپ ﷺ کی شفقت ومہربانی انسانوں سے آگے بڑھ کر جانوروں پر بھی سایہ فگن تھی۔ اس شفقت ومہربانی نے بڑے سرکش دشمنانِ دین کو بھی اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر وہ اسلام کے جاں نثار سپاہی بن گئے۔ بنوحنیف کے رئیس ثمامہ بن اثال قیدی بنا کر نبی کریم ﷺ کے خدمت میں لائے گئے۔ یہ ثمامہ بڑے سخت دشمنِ اسلام تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر اسلام پیش کیا تو ثمامہ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو مسجدِ نبوی کے اندر ہی ایک ستون سے باندھ دیا جائے۔ دوسرے دن نبی کریم ﷺ نے ثمامہ کو اپنے پاس طلب کیا اور اسلام کے بارے میں رائے پوچھی۔ ثمامہ نے کہا کہ اگر آپ مجھے چھوڑتے ہیں تو ایک کریم نفس کو چھوڑتے ہیں۔ اگر مال چاہتے ہیں تو آپ کو مال دیا جائے گا اور اگر خون کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص کا خون کریں گے، جس کے لیے بہت سا خون بہے گا۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو ستون سے باندھ دیا جائے۔ تیسرے روز آپ ﷺ نے ثمامہ سے پھر ان کی رائے پوچھی تو ثمامہ نے وہی جواب دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو چھوڑ دیا جائے۔ ثمامہ نے وہیں قریب میں جا کر غسل کیا اور حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ مجھے کلمہ پڑھایا جائے۔ اس کے بعد ثمامہ کہنے لگے کہ مجھے پہلے آپ کے چہرے سے زیادہ مبغوض چہرہ کوئی نہیں تھا اور اب آپ کے چہرے سے زیادہ محبوب چہرہ کوئی نہیں۔ (ترمذی)

تالیفِ قلوب

نبی کریم ﷺ عقل و دانائی میں کامل تھے۔آپ ﷺ نے انسانوں کی روحانی تربیت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے انسانی نفسیات کی بھی رعایت کی ہے۔بہت سے لوگ مسلمان ہوتے تو انھیں اپنی برادری کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑتا۔بعض لوگ اپنی وجاہت کے ساتھ ساتھ مال کا بھی نقصان سہتے۔ایسے وقت میں جب ان لوگوں کے دلوں کو ڈھارس دینے کی ضرورت تھی اور انھیں اسلامی برادری میں ضم کرنا ضروری تھا،معلمِ انسانیت نے ان لوگوں کے لیے عطیات مقرر فرمائے، مالِ غنیمت میں ان لوگوں کے لیے خاص حصہ مقرر فرمایا۔اس کریمانہ سلوک نے ان نومسلموں کے حوصلے بلند کیے اور جو لوگ قبولِ اسلام میں تردد کا شکار تھے،ان کے دل موہ لیے۔اگرچہ صفوان بن امیہ اس دن تک مسلمان نہیں ہوئے تھے؛لیکن ہوازن کی جنگ میں شریک ہوئے۔جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو بہت سا مال ہاتھ لگا۔رسول اللہ ﷺ مالِ غنیمت دیکھ رہے تھے اور صفوان آپ کے ساتھ تھے۔

تبشیر (خوش خبری دینا)

حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کرتے ہوئے یہ اصول بھی تلقین فرمایا تھا کہ ”یسرا و لاتعسرا بشرا و لاتنفرا“یعنی آسانی کرنا،تنگی نہ کرنا۔خوش خبری دینا اور متنفر نہ کرنا۔ خود آپ ﷺ نے اپنی دعوت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ملنے والے اجر و ثواب کو کھول کھول کر بیان فرمایا۔جنت اور اس کی نعمتوں کو بیان فرمایا۔جنت کی نعمتوں کو اس انداز سے بیان فرمایا کہ نہ کسی آنکھ نے انھیں دیکھا نہ کسی کان نے ان کی خوبیوں کو سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان بلند پایہ نعمتوں کا خیال گزرا۔

انسانی طبائع کا خاصہ ہے کہ نفع کی طرف مائل ہوتی ہیں۔آپ نے کسی کام کے لیے کسی کو تیار کرنا ہے تو آپ اس کام کے فائدے اسے بیان کرکے اس کے شوق کو مہمیز دیتے ہیں۔پھر مشکل سے مشکل کام انسانی ہمت کے سامنے دم توڑ دیتا ہے۔جنت کی طلب اور اس میں ملنے والی ابدی رضا و لقائے خداوندی کے لیے تو بس نفس کی مخالفت درکار ہے۔آگے کے تمام مراحل طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔آپ ﷺ نے اپنی دعوت میں تبشیر و ترغیب کے اصول کو قائم رکھا،جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

بنی مالک بن کنانہ کے ایک آدمی کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو بازار ذوالمجاز کے وسط میں دیکھا تھا۔آپ ﷺ فرماتے تھے،لوگو!لاالٰہ الا اللہ کہہ دو، کامیاب ہو جاؤ گے۔اس قسم کے

دوسرے بہت سے واقعات موجود ہیں، جن میں آپ ﷺ نے تبشیر وترغیب کے اصول کو مدنظر رکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم اس بات کو قبول کرلو، جو میں لے کر آیا ہوں تو تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں فائدہ ہے۔ (ابن کثیر 3 /24)

تنذیر (ڈرانا)

کبھی طبیعت ایسی سخت ہو جاتی ہے کہ اس پر نرم بات کارگر نہیں ہوتی۔ خوش خبری سنانے پر بجائے یہ کہ وہ مزید ہمت کے ساتھ عمل میں لگتے، الٹا ان کی جرأت اَور بڑھ جاتی ہے۔ جب وہ سرے سے توحید ورسالت کے ہی منکر ہوں تو دنیوی عیش ونشاط ہی کل کائنات معلوم ہوتے ہیں۔ ان حالات میں نبی اور داعی انھیں دردناک عذاب کی خبر دیتے ہیں؛ تاکہ وہ بڑے نقصان سے بچ سکیں۔ اس ڈراوے میں انھیں دنیوی تکالیف یاد دلا کر آخرت کی کئی گنا زائد تکلیفوں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ احادیث میں مختلف گناہوں کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے پوری خیر خواہی کے ساتھ امت کے سامنے کفر، شرک، حسد اور دیگر تمام گناہوں کے ہول ناک انجام کو اجمالاً یا تفصیلاً بیان فرمایا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے (وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ) (الشعراء: 214) آیت نازل فرمائی تو آپ صفا پہاڑی پر گئے اور پکارا یاصباحاہ! (اے لوگو! دشمن صبح صبح حملہ کرنے والا ہے) سب آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے بنوعبدالمطلب! اے بنوفہر! اے بنوکعب! اگر میں تمھیں بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دامن میں لشکر ہے، جو تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم مجھے سچا مان لو گے؟ سب نے کہا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمھیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے اس سے ڈرانے والا ہوں۔ ابولہب بولا: تو برباد ہو جائے، ہمیں محض اسی لیے بلایا تھا؟ اس پر اللہ عز وجل نے سورۃ "تبت یدا" نازل فرمائی۔ (متفق علیہ، صحیح البخاری: 4971، صحیح مسلم: 208)

* * *

بنتِ حوا کا وقار حجاب میں!

از: مولانا محمد عمر قاسمی کاماریڈی
استاذ ابوہریرہ اکیڈمی اورنگ آباد

''حجاب'' صرف اسلامی شعار اور مذہبی فریضہ ہی نہیں؛ بلکہ عزت و ناموس کا محافظ، تحفظِ شرم و حیا کا ضامن، فطرتِ نسواں کا متقاضی، انسدادِ فواحش کا باعث، پاک باز اور عزت مآب خواتین کا وقار اور انتخاب، بے حیائی و بدکاری کی روک تھام کا مؤثر اور بہترین ذریعہ، جوہرِ عفت وعصمت کا پاسباں، بدقماش اور شرپسند بھیڑیوں اور ہوس پرست درندوں سے ڈھال اور سپر اور پاک دامن و بدکردار کے مابین حدِ فاصل ہے؛ مختصر یہ کہ ''حجاب'' فطرتِ نسوانی اور رمزِ مسلمانی ہے، تہذیب و شائستگی کی بنیاد اور عظمت کی نشانی ہے؛ کیوں کہ

اسلام میں ہر طرح بجا ہے پردہ
نسواں کے لیے حسن وحیا ہے پردہ
پردے کی حقیقت میں وہ عظمت ہے رفیقؔ
خالق نے بھی خلقت سے کیا ہے پردہ

حجاب کا مقصد اور مقام!

اسلام میں حجاب کا مقصد خواتین کو تحفظ فراہم کرنا ہے، نہ کہ قید و پابند کرنا؛ یہی وجہ ہے کہ جذبات واحساسات اور اخلاق وکردار کو آوارگی سے بچائے رکھنے، تہذیب وتمدن کو زوال وسقوط سے محفوظ رکھنے، معاشرتی برائیوں کا سدباب کرنے، اور خانگی زندگی کو خوش گوار اور کام یاب بنانے میں حجاب کا اہم کردار رہا ہے، عقل اور قیاس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو شئ جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کو اتنا ہی

چھپا کر رکھنا چاہیے، نہ کہ اسے سڑکوں پر برسرِ عام نکالا جائے اور لوگ اس سے مستفید ہوں؛ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عورت کے لیے اجتماعی نماز کی بہ نسبت انفرادی نماز کو ترجیح دی ہے اور یہ سب صرف جوہرِ عفت کے تحفظ کی خاطر ہے۔

مذہبِ اسلام، جوہرِ عفت کا نگہبان

دینِ اسلام کی پاکیزہ شریعت میں فرائض کی ادائیگی کے بعد جس حکم کو سب سے زیادہ اہمیت اور اوّلیت حاصل ہے، وہ عفت، پردہ اور حجاب ہے۔ یہ محض ایک ظاہری رسم نہیں؛ بلکہ روح کی طہارت اور معاشرتی پاکیزگی کا ضامن ہے۔ تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ ہجرت کے پانچویں سال جب پردے کی فرضیت کا حکمِ الٰہی نازل ہوا، تو اس نے مسلم معاشرے کو حیا کے ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ قرآنِ کریم کی سات مبارک آیات اور سرورِ کائنات ﷺ کی ستر سے زائد احادیثِ مبارکہ اس امر کی گواہ ہیں کہ شریعتِ مطہرہ نے عورت کے وقار اور اس کی عفت کے تحفظ کے لیے حجاب کو لازم قرار دیا ہے۔

حجاب کا اصل مقصود عورت کی نسوانیت کو فتنوں کی زد سے بچانا ہے۔ اس سرمایۂ حیا میں سب سے کلیدی حیثیت ''چہرے کے پردے'' کو حاصل ہے؛ کیوں کہ چہرہ ہی انسانی حسن کا مرکز، جاذبیت کا محور اور فتنوں کا بنیادی سبب بنتا ہے۔ جسم کے باقی اعضا تو عموماً لباس کی تہوں میں مستور ہوتے ہی ہیں؛ لیکن اصل امتحان چہرے کا ہے۔ اسی لطیف نکتہ کی جانب رہنمائی کرتے ہوئے خالقِ کائنات نے سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا:

''يَاۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَ بَنٰتِكَ وَ نِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ'' (سورۃ الاحزاب، آیت: ۵۹)

ترجمہ: ''اے نبی ﷺ! اپنی ازواجِ مطہرات، اپنی بیٹیوں اور مؤمن عورتوں سے فرما دیجیے کہ اپنے (چہروں) پر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔''

ایسی ہی ایک اور ربانی ہدایت امہات المؤمنین کے حوالے سے نازل ہوئی جو قیامت تک کی خواتین کے لیے مشعلِ راہ ہے: ''وَ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' (سورۃ الاحزاب، آیت: ۵۳)

ترجمہ: ''اور جب تم ان سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔''

حجاب: عادت بھی، عبادت بھی

شریعتِ اسلامی میں زندگی کا کوئی گوشہ، کوئی عادت یا عبادت ایسی نہیں جہاں عورت کو حجاب کی قید سے آزاد کیا گیا ہو۔ جب کوئی ناگزیر ضرورت عورت کو گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم رکھنے پر مجبور کرے، تو اس کے لیے بھی ایک خاص قرآنی دستور اور ضابطہ مقرر ہے کہ جب وہ باہر نکلے تو: چادر یا برقع کا اہتمام ہو۔ خوشبو کی مہک سے فضا معطر نہ ہو۔ ایسے زیورات سے پرہیز ہو جو اپنی جھنکار سے متوجہ کریں۔ شاہراہوں کے بیچ میں چلنے کے بجائے راستوں کے کناروں کا انتخاب کیا جائے۔ مردوں کے ہجوم اور اختلاط سے دامن بچا کر گزرا جائے۔

یہ تمام سختیاں دراصل پابندیاں نہیں؛ بلکہ اس ''جوہرِ عفت'' کی حفاظت کے لیے لگائے گئے پہرے ہیں جو اسلام نے عورت کو عطا کیا ہے۔

اہلِ حقیقت اور صاحبانِ بصیرت کی نظر میں ایک نیک بخت عورت کا اصل حسن و جمال اس کا خوفِ خدا ہے۔ اس کی دولت قناعت ہے اور اس کا سب سے قیمتی زیور عفت و عصمت اور تہمت کی جگہوں سے اجتناب ہے۔

حجاب، احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

کتابِ الٰہی کے ان محکم احکام کی تائید وتشریح احادیثِ نبویہ کے بحرِ بے کنار سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتِ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ (سنن ترمذی/کتاب الرضاع/حدیث:۱۱۷۳)

ترجمہ: ''عورت سراپا پردہ (چھپانے کی چیز) ہے، جب وہ گھر سے نکلتی ہے تو شیطان اس کے پیچھے لگ جاتا ہے۔''

اس فرمانِ عالی شان سے واضح ہوتا ہے کہ پردے کا تعلق کسی ایک عضو سے نہیں؛ بلکہ عورت کے پورے وجود سے ہے۔

حیا کا یہ معیار کس قدر بلند تھا، اس کا اندازہ مسندِ احمد کی اس روایت سے لگائیے کہ ایک مرتبہ درِ رسول ﷺ پر ایک نابینا صحابی، حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ حاضر ہوئے۔ وہاں امہات المؤمنین حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما موجود تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سے پردہ کرو۔''

انھوں نے حیرت سے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! وہ تو نابینا ہیں (وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے)۔'' تو معلمِ انسانیت ﷺ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک کے لیے اصول بن گیا: ''کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟'' (مسند احمد، ۲۹۶/۶)

غور کیجیے! جہاں ایک نابینا مرد سے بھی پردے کا حکم دیا جا رہا ہو، وہاں بینا مردوں کے سامنے بے حجاب ہونا کس قدر بڑی غفلت ہوگی۔

خیر القرون کا درخشندہ طرزِ عمل

اگر ہم تاریخ کے اس پاکیزہ ترین دور خیر القرون پر نظر ڈالیں، تو دل حضرات صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے جذبۂ امتثالِ حکمِ الٰہی سے ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

چناں چہ ایک صحابیہ کا لختِ جگر شہید ہوگیا۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر، نقاب اوڑھے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنے بیٹے کا حال پوچھنے حاضر ہوئیں۔ اس کٹھن گھڑی میں بھی نقاب دیکھ کر کسی نے حیرت سے کہا: ''اس مصیبت کے وقت بھی نقاب؟'' تو اس غیرت مند خاتون کے تاریخی الفاظ تھے: ''میں نے اپنا بیٹا کھویا ہے، اپنی حیا نہیں کھوئی!'' (سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد)

سبحان اللہ! یہ شدید ترین غم بھی ان کے ہاتھ سے حیا کا دامن نہ چھڑا سکا۔

صرف یہی نہیں؛ بلکہ عبادت کی غرض سے گھر سے نکلتی تو اس طرح کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ خواتین فجر کی نماز کے لیے مسجدِ نبوی میں حاضر ہوتیں، وہ اپنی چادروں میں اس طرح لپٹی ہوتی تھیں کہ جب نماز کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتیں تو اندھیرے اور پردے کی کثرت کے باعث کوئی انھیں پہچان نہ پاتا تھا۔ (صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

یہ روایت واضح کرتی ہے کہ چہرہ سمیت پورا جسم چادروں میں چھپا ہوتا تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے رضاعی چچا ''افلح'' جب ان سے ملنے آئے، تو انھوں نے انتہائی احتیاط کے پیشِ نظر پردہ فرمالیا اور ملاقات سے انکار کردیا۔ بعد میں جب آپ ﷺ نے آکر شرعی مسئلہ واضح کیا کہ وہ رضاعی چچا ہونے کے ناطے محرم ہیں، تب جا کر انھوں نے ملاقات کی۔ (صحیح مسلم، کتاب الرضاع)

مشہورِ زمانہ واقعہ افک میں جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قافلے سے بچھڑ گئیں اور بیدار ہوکر انھوں نے دیکھا کہ حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ وہاں پہنچ چکے ہیں (جنھوں نے پردے کا حکم آنے

سے پہلے آپؓ کو دیکھا تھا اور پہچان کر بلند آواز سے انا للہ پڑھا)، تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ’’ان کی آواز سن کر میں بیدار ہوئی اور فوراً اپنی چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔‘‘ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

الغرض یہ پاکیزہ تذکرے، یہ نورانی واقعات اور یہ قرآنی فرامین ہمیں جھنجھوڑتے ہیں۔ صحابۂ کرامؓ اور صحابیاتؓ کی نظر میں پردے کی کیا اہمیت تھی اور وہ اس پر کس قدر سختی سے کاربند تھے، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ جسم کے ساتھ ساتھ چہرے کا پردہ ان کا شعار تھا؛ مگر افسوس! آج ہم اپنی عارضی خواہشات کی تکمیل اور فیشن کی مسموم ہواؤں کے جھونکوں میں آکر حجاب کو ایک ’’بوجھ‘‘ تصور کرنے لگے ہیں اور بے حجابی کو آزادی کا نام دے بیٹھے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس قرآنی دستور کو دوبارہ اپنائیں؛ تاکہ معاشرہ پھر سے امن، طہارت اور حیا کا گہوارہ بن سکے۔

ہندودھرم میں حجاب کا تصور!

حجاب اور پردے کا تصور صرف دینِ اسلام تک محدود نہیں ہے؛ بلکہ قدیم ہندو تہذیب اور سنسکرتی میں بھی اس کے واضح شواہد ملتے ہیں۔ ان کے مذہبی لٹریچر اور تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی خواتین کے لیے حیا کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

اس کی ایک نمایاں مثال مہابھارت کے ایک واقعے میں ملتی ہے۔ جب متھرا کے راجہ اور سری کرشن کے ماموں، کنس نے دنگل (کشتی کے مقابلے) کا انعقاد کیا، تو مستورات کے بیٹھنے اور تماشہ دیکھنے کے لیے الگ اور مخصوص بالاخانے تعمیر کروائے گئے۔ یہ مقامات اس قدر بلندی پر واقع تھے کہ فضا میں اڑتے ہوئے راج ہنس بھی وہاں سے نیچے دکھائی دیتے تھے۔ ان بلند مقامات پر باریک جالیوں کا پردہ لٹکایا گیا تھا؛ تاکہ خواتین پردے میں رہ کر باہر کے مناظر دیکھ سکیں؛ لیکن نیچے موجود ہجوم کی نظریں ان پر نہ پڑ سکیں۔ (مہابھارت: وشو پرب ادھیائے ۱۹)

ہماری ناگفتہ بہ صورت حال

موجودہ دور میں سماجی اقدار کا زوال اور معاشرتی ترجیحات کی تبدیلی ایک لمحۂ فکریہ بن چکی ہے۔ مادی منفعت اور ہوسناکی کے اس ماحول میں صنفِ نازک کو تجارتی تشہیر اور بازاری مفادات کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ جدید فیشن اور طرزِ لباس کے نام پر ایسے ملبوسات متعارف کروائے جارہے ہیں جو ستر پوشی کے بجائے عریانیت کو فروغ دیتے ہیں اور آرائش وزیبائش کے ایسے مصنوعی طریقے اپنائے جارہے

ہیں جو فطری حسن کو مسخ کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اس مہم جوئی کو ’’حقیقی آزادی‘‘ کا نام دے کر قبول کیا جا رہا ہے، جب کہ اخلاقی و مذہبی حدود کو قدامت پسندی اور قید و بند سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں وہ آزادی محض ایک فریب ہے جو عفت مآب کو مجروح کرے اور وہ مساوات ایک سراب ہے جو انسان کو اس کی اصل اخلاقی ذمہ داریوں اور مقصدِ تخلیق سے غافل کر دے۔

تباہی کا یہ سیلاب صرف غیروں تک محدود نہیں رہا؛ بلکہ مسلم معاشرے کا وہ طبقہ بھی اس کی زد میں ہے جو خود کو دین دار تصور کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں حجاب کی اہمیت دھندلا چکی ہے؛ غیر محرموں کے ساتھ بلا جھجک میل جول، بے تکلف گفتگو، اور ڈیجیٹل ذرائع (اسمارٹ فون، سوشل میڈیا پلیٹ فارمز) پر غیر ضروری رابطوں کو اب معیوب ہی نہیں سمجھا جاتا۔

دوسری طرف، جہاں پردے کی روایت برقرار بھی ہے، وہاں وہ اکثر حقیقی روح سے خالی اور محض ایک رسمی عادت بن کر رہ گئی ہے۔ جسم پر برقع تو موجود ہوتا ہے؛ مگر چہرہ بے نقاب رہتا ہے، یا پھر برقع خود اس قدر چست، زرق برق اور دیدہ زیب ہوتا ہے کہ وہ حجاب بننے کے بجائے خود توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خروج کسی ضرورت کے تحت نہیں؛ بلکہ زیبائش کی نمائش اور بہ ظاہر دوسروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ طرزِ عمل حجاب کے اصل فلسفے — جو کہ حیا اور وقار کا ضامن ہے — کے سراسر منافی ہے۔

فرقہ پرستوں کی سازش!

ہمارا وطنِ عزیز اپنی صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب اور کثرت میں وحدت کے حسن کے لیے جانا جاتا ہے؛ تاہم، حالیہ برسوں میں ملکی سیاست کا رخ جس طرح مذہبی خطوط پر موڑا جا رہا ہے، وہ ایک سنجیدہ فکر کا متقاضی ہے۔ اقتدار اور سیاسی مفادات کے لیے اکثر ایسے مسائل کو ہوا دی جاتی ہے جن کا مقصد عوامی توجہ کو حقیقی سماجی و معاشی مسائل سے ہٹانا ہوتا ہے۔ گذشتہ سالوں میں مختلف ریاستوں، جیسے کرناٹک اور راجستھان میں حجاب کے معاملے کو جس طرح پبلک ڈسکورس (عوامی بحث) کا حصہ بنا کر ہنگامہ آرائی کی گئی، وہ اسی سیاسی حکمتِ عملی کا ایک مظہر معلوم ہوتا ہے۔

اس پورے تناظر میں ایک بڑا تضاد بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف عوامی نمائندے اور مختلف رہنما خود پارلیمنٹ، اسمبلیوں اور دیگر عوامی مقامات پر اپنے مخصوص مذہبی یا روایتی ملبوسات آزادی کے ساتھ زیبِ تن کرتے ہیں؛ لیکن دوسری طرف جب مسلم طالبات تعلیمی اداروں کے ضابطوں

کے مطابق لباس کے ساتھ حجاب کا اہتمام کرنا چاہتی ہیں،تو اسے متنازع بنادیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل سے صرف اور صرف دوغلا پن جھلکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تنازعات کو کھڑا کرنے والوں کا مقصد کسی مذہبی روایت کا تحفظ یا اصلاح نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کے پیچھے خالصتاً سیاسی مفادات کارفرما ہوتے ہیں۔ انتخابی سیاست کے دوران معاشرے کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنا،نفرت انگیز بیانات کے ذریعے فضا کو مسموم کرنا،اور شہریوں کے مابین خلیج پیدا کرنا ایک باقاعدہ حربہ بن چکا ہے۔ یہ کوششیں ملک کے جمہوری اور سیکولر تانے بانے کو نقصان پہنچاتی ہیں،جس کی وجہ سے یہ تاریخی خطہ باہمی خلفشار کا شکار ہورہا ہے۔

حجاب اور برقع کیسا ہونا چاہیے؟

دورِ نبوت کی پاکیزہ زندگی اور اس عہد کا معاشرہ ہمارے لیے رشد و ہدایت کا وہ مینارِ نور ہے، جہاں حجاب اور پردے کا تصور کسی بناوٹی زیبائش یا ہیجان انگیزی سے پاک تھا۔اس عہدِ زریں میں برقع اور چادریں سادگی،وقار اور کشادگی کا مظہر تھیں،جس کے سائے میں خواتینِ اسلام سرتاپا مستور رہ کر عفت و حیا کی وہ اعلیٰ مثالیں قائم کرتی تھیں جو رہتی دنیا تک پوری انسانیت کے لیے لائقِ تقلید ہیں۔

اگر ہم آج بھی اپنے حجاب کو شریعت کے حقیقی سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں،تو اس کے لیے درج ذیل بنیادی شرائط کا لحاظ رکھنا ناگزیر ہے:

(۱) جامع ستر پوشی: برقع اس طرح ہو جو پورے جسم کو ڈھانپ لے۔

(۲) موٹا کپڑا: کپڑا اتنا باریک نہ ہو کہ اس سے جسم کی ساخت نمایاں ہو۔

(۳) کشادگی اور وسعت: لباس کشادہ ہو،اس میں اس درجے تنگی نہ ہو جو جسم کے خدوخال کو ظاہر کرے۔

(۴) سادگی: نقاب اور برقع بذاتِ خود اظہارِ زینت اور توجہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہ ہوں۔

(۵) پھوٹنے والی خوشبو سے احتراز: باہر نکلتے وقت عطر یا ایسی خوشبو کا استعمال نہ کیا گیا ہو جو دوسروں کو متوجہ کرے۔عورتوں کی خوشبو میں رنگ زیادہ ہوتا ہے اور مردوں کی خوشبو میں مہک زیادہ ہوتی ہے۔

(۶) مردانہ شباہت سے دوری: لباس مردوں کے مخصوص طرزِ پوشاک سے مشابہ نہ ہو۔

(۷) تشبہ بالکفار سے پاک ہو: غیر مسلموں کے مذہبی یا مخصوص تہذیبی لباس کی نقل نہ کی گئی ہو۔

(۸) حسنِ نیت کا لحاظ ہو یعنی لباس پہننے میں ریا کاری، نمود و نمائش یا سماجی تفاخر کا کوئی جذبہ کارفرما نہ ہو۔

جب یہ اوصاف کسی حجاب کا حصہ بنتے ہیں، تبھی وہ ''حجابِ شرعی'' کا درجہ پاتا ہے اور اسی کے ذریعے بنتِ حوا کی چادرِ عفت زمانے کے ہوسناک طبقے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

کرنے کے اہم کام

اگر ہماری خواہش ہے کہ نئی نسل اور دخترانِ ملت کی عزت و آبرو پامال نہ ہو، اور ان کے اخلاق و کردار بے داغ رہیں تو انفرادی و اجتماعی اصلاح کے لیے درج ذیل ترجیحات پر عمل درآمد وقت کی اہم ضرورت ہے:

(۱) شریعت کی کامل تابعداری

ہمیں چاہیے کہ اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کریں، منشائے شریعت کو سمجھیں اور اسے اپنی عملی زندگی کے ہر گوشے میں نافذ کریں۔ اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کر کے احکامِ الٰہی کو مقدم رکھیں اور دین پر چلنے کے معاملے میں کسی ملامت کی پروا نہ کریں۔

(۲) اغیار کی نقالی سے اجتناب

موجودہ دور کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے اکثر معاملات میں غیروں کی اندھی تقلید اور فیشن پرستی کے نشے میں مست ہو چکے ہیں؛ یہاں تک کہ مسرت و شادمانی کے مواقع پر مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز ہی مٹ جاتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی تہذیبی شناخت کو کھو کر دوسروں کے رنگ میں رنگ جانا اخلاقی اور شرعی طور پر سخت ناپسندیدہ ہے۔

(۳) تعلیم اور ایجوکیشن کو فروغ دیں

موجودہ پسماندگی سے نکلنے اور ایک روشن مستقبل کی تعمیر کا واحد راستہ تعلیم و تربیت کا فروغ ہے۔ اس کے لیے ''اسلامک اسکولز'' کا قیام ضروری ہے، اگر ہم نے علم و دانش کے چراغ روشن نہ کیے تو جہالت کا اندھیرا ہماری شناخت کو نگل جائے گا۔ عصری اور دینی علوم کا امتزاج ہی ہماری بقا کا

ضامن ہے۔

(۴)اسوۂ صحابیات کا مطالعہ

امتِ مسلمہ کے لیے معیارِ ایمان صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت ہے۔ہمیں اپنے اندر وہی دینی حمیت اور ایمانی غیرت بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔خواتینِ اسلام کو چاہیے کہ وہ صحابیات کی پاکیزہ اور باحیا زندگی کو اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں۔ چمک دمک اور عارضی فیشن کی قربانی دے کر اس شرعی حجاب کو اپنائیں جو ان کی حقیقی عزت اور وقار کا محافظ ہے۔

(۵)نامساعد حالات میں سنجیدہ حکمتِ عملی

حالات کا ناسازگار ہونا اور مخالفتوں کا سامنا کرنا زندگی کا ایک فطری حصہ ہے۔ایسے ہنگامی مواقع پر محض وقتی جذبات کے تحت فیصلے کرنے اور پھر ٹھنڈا پڑ جانے سے کوئی تعمیری نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ضرورت اس امر کی ہے کہ حدودِ شریعت اور قانون کے دائرے میں رہ کر، مکمل سنجیدگی اور دور اندیشی کے ساتھ ایسے مؤثر اقدامات کیے جائیں جو طویل المیعاد بنیادوں پر مفید ثابت ہوں۔

(۶)نسلِ نو کی فکری و اخلاقی تربیت

ایک انسان کے لیے صرف اپنی ذات کی حد تک نیک ہوجانا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے اہل و عیال اور اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا بھی اس کا اولین فریضہ ہے۔ہمیں یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے زیرِ اثر افراد اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔ (صحیح بخاری:۴۹۰۴)

مختصر یہ کہ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے گھروں کے ماحول کو اسلامی نہج پر استوار کریں۔روزمرّہ کی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ان کے ساتھ بیٹھیں، ان کی تعلیمی و اخلاقی صورت حال کا جائزہ لیں، اور انھیں بُری صحبتوں سے بچائیں۔خاص طور پر اسمارٹ فون کے بے جا اور غیر ضروری استعمال سے انھیں دور رکھیں، جو اکثر اوقات اخلاقی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ بچوں کے ذہنوں میں حجاب کی حقیقی اہمیت اور اس کے فلسفے کو اجاگر کریں۔

دوسری طرف، نئی نسل کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں

ڈھالنے کی مخلصانہ کوشش کرے۔ جب فکر اور عمل کی یہ دوطرفہ اصلاح ہوگی، تبھی معاشرے میں کوئی حقیقی اور پائیدار تبدیلی رونما ہوسکتی ہے۔

دردمندانہ التماس

سلامِ عقیدت قوم کی ان باہمت، غیور اور مخلص بیٹیوں، بہنوں اور ماؤں کے نام! جنہوں نے آئینی و مذہبی آزادی اور اسلامی شعار کی بقا و تحفظ کے لیے جرأت واستقامت کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ وقت کی جابرانہ روش، تعصب اور تاناشاہی کے سامنے سرنگوں ہونے کے بجائے، انھوں نے مخلوق کی خوشنودی پر خالقِ کائنات کی فرماں برداری کو ترجیح دی۔

ان باوقار خواتین نے قانونی حدود اور آئینی دائرۂ کار کے اندر رہتے ہوئے، جس شجاعت اور عزمِ صمیم کے ساتھ فرقہ پرست عناصر کی زہریلی ہنگامہ آرائی کا مقابلہ کیا، وہ لائقِ تحسین ہے۔ نامساعد حالات میں ان کا یہ استقلال عہدِ صحابیات کے اس جذبہ ایمانی کی یاد تازہ کرتا ہے جو باطل کے سامنے کبھی کمزور نہیں پڑا۔ انھوں نے اپنے عمل اور عزم سے یہ ثابت کردیا ہے کہ حیا اور حجاب ان کی کمزوری نہیں؛ بلکہ ان کا وقار اور ناقابلِ تسخیر حصار ہے۔ اور زبانِ حال وقال سے کہہ دیا کہ

ہے گل کے لیے رنگت، رنگت کے لیے پردہ
سیرت کے لیے صورت، صورت کے لیے پردہ
کیا خوب بنایا ہے ستارِ حقیقی نے
پردے کے لیے عورت، عورت کے لیے پردہ

* * *

تقویٰ کی اہمیت

از قلم: محمد عادل ارریاوی

تقوی اسلام کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے جس کے بغیر ایمان کی حفاظت اور اعمال کی درستگی ممکن نہیں قرآن کریم نے بار بار تقویٰ کی طرف توجہ دلائی ہے اور اسے ہدایت سکونِ قلب اور اللہ کی محبت کا ذریعہ قرار دیا ہے قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ میں تقویٰ کی غیر معمولی اہمیت اور عظمت کو بار بار بیان کیا گیا ہے قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کا خوف خشیت اور پرہیزگاری کا ذکر ملتا ہے؛ بلکہ شاید ہی کوئی سورت ایسی ہو جس میں تقویٰ اور خوفِ خدا کی طرف توجہ نہ دلائی گئی ہو حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ ہی انسان کے لیے گناہوں سے بچنے کا مضبوط ذریعہ ہے جب انسان رات کی تنہائی میں ہو کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو تو اسی وقت اللہ کا خوف اسے معصیت سے روکتا ہے شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کے دو بنیادی مفہوم بیان کیے جاتے ہیں ایک ڈرنا اور دوسرا بچنا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصد بچنا ہی ہے یعنی گناہوں سے محفوظ رہنا اور اس کا سبب دل میں اللہ کا خوف ہونا ہے؛ کیونکہ جب کسی چیز کا خوف دل میں پیدا ہو جائے تو انسان لازماً اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس اعتبار سے تقوی کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان ظاہر و باطن کے تمام گناہوں سے اجتناب کرے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ ممنوعات سے بچے اور اللہ کے احکام کو پورا کرے؛ کیونکہ جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے انہیں چھوڑ دینا بھی گناہ ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تمام معاصی سے بچا جائے اور فرائض و واجبات کی ادائیگی کی بھرپور کوشش کی جائے خاص طور پر آنکھ کان زبان اور ذہن ان چاروں اعضاء کی حفاظت نہایت ضروری ہے، ان کا غلط استعمال انسان کو بہت سی خرابیوں میں مبتلا کر دیتا ہے، یہ چاروں علم کے دروازے ہیں اور انہی کے ذریعے علم کا نور دل میں داخل ہوتا ہے اگر یہ ذرائع آلودہ ہو جائیں تو وہ نور جو اللہ کی معرفت اور اس سے تعلق کا ذریعہ بنتا ہے دل میں داخل نہیں ہو پاتا اور نہ ہی علم صحیح طریقے

سے محفوظ رہتا ہے؛ اس لیے لازم ہے کہ انسان ان اعضا کو پاکیزہ رکھے۔

جو شخص تقویٰ کو اپنا شعار بنالیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قرآن کریم سے حقیقی فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرماتا ہے، ایسے انسان کو قرآن کی تلاوت اس کے ترجمے اور معانی کو سمجھنے کا شوق اور سعادت نصیب ہوتی ہے، قرآن کریم کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں الم ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (البقرہ۱) یعنی یہ وہ عظیم کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں اور یہ مکمل ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو تقوی اختیار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی ہر بات یقینی اور حق ہے انسان کی لکھی ہوئی کوئی بھی کتاب شک وخطا سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوسکتی؛ کیونکہ انسان کا علم محدود ہوتا ہے اور اس کی تحریر اکثر ذاتی فہم اور اندازے پر مبنی ہوتی ہے؛ لیکن چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے جس کا علم لامحدود اور یقینی ہے؛ اس لیے اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ اس کی اپنی کم فہمی کا نتیجہ ہے کتاب میں کوئی نقص نہیں۔ اگرچہ قرآن کریم نے ہدایت کا راستہ ہر انسان کے سامنے واضح کردیا ہے چاہے وہ مومن ہو یا کافر؛ لیکن عملی فائدہ صرف انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اس پر ایمان لاکر اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں؛ اسی لیے فرمایا گیا کہ یہ ہدایت ہے متقیوں کے لیے یعنی ان لوگوں کے لیے جو بن دیکھے حقائق پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں پرہیزگاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر وقت اس بات کو ذہن میں رکھے کہ ایک دن اسے اللہ کے سامنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے؛ اس لیے کوئی ایسا کام نہ کرے جو اللہ کی ناراضی کا سبب بنے اسی مستقل احساس اور خوف کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ جو شخص تقویٰ کی زندگی اپناتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوتی ہے اللہ نیک بندوں سے محبت فرماتا ہے اور نیک بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (آل عمران۷۶) یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔

آج کا ناسمجھ انسان کسی دوشیزہ کو دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے دل میں خیالات بٹھالیتا ہے اس کی تصویریں موبائل میں محفوظ کرلیتا ہے اور دوسروں کو دکھا کر فخر محسوس کرتا ہے۔ اے اللہ کے نادان بندے! تو نے مخلوق کے حسن کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہوگیا؛ مگر کبھی یہ نہ سوچا کہ جس نے یہ حسن بنایا ہے وہ کتنا حسین ہوگا؛ حالانکہ یہ ظاہری خوبصورتی عارضی ہے، چند دن کی بیماری آجائے تو سارا حسن ماند پڑجاتا ہے اگر کوئی جلدی مرض لاحق ہوجائے تو ساری دلکشی ختم ہوجاتی ہے۔

آج انسان کی پریشانی کی اصل وجہ دل کا بے سکون ہونا ہے قرآن کہتا ہے أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ یادرکھو دلوں کا سکون صرف اللہ کے ذکر میں ہے، تقویٰ کے اندر ہی حقیقی اطمینان پوشیدہ ہے اور اطمینانِ قلب ایک ایسی عظیم نعمت ہے جسے دنیا کی کوئی دولت خرید نہیں سکتی، مادہ پرستی میں انسان سکون کے لیے تڑپ رہا ہے؛ حالانکہ اس نعمت کو پانے کا سب سے آسان راستہ اللہ سے مضبوط تعلق اور اس کی یاد کو دل میں بسانا ہے۔ آج کا انسان یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ فلاں چیز مل جائے تو سکون مل جائے گا؛ حالانکہ تمام لذتوں سے بڑھ کر لذت اللہ کی یاد میں ہے، اللہ کے ذکر سے زیادہ کسی چیز میں راحت نہیں۔ مختصر یہ کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو جاتی ہے مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ کا نام میری زبان سے نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے وجود کا ہر ذرہ شہد کے دریا میں ڈوب گیا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت اس درجے تک کیسے پہنچے کہ وہ سب محبتوں پر غالب ہو جائے؟ اگر اللہ کی محبت سب سے زیادہ نہ ہوئی تو یاد رکھیے کہ ہم اللہ کے مکمل فرماں بردار نہیں بن سکتے؛ اس لیے کہ جب انسان کو اپنا دل زیادہ عزیز ہو جاتا ہے تو جہاں دل کو تکلیف محسوس ہوتی ہے وہاں وہ اللہ کے حکم کو توڑ دیتا ہے مثال کے طور پر کوئی حسین منظر سامنے آ گیا، دل چاہتا ہے اسے دیکھے اگر نہ دیکھے تو دل کو تکلیف ہوتی ہے، اگر اللہ زیادہ محبوب ہے تو انسان دل کی خواہش کو قربان کر دے گا اور اللہ کو راضی کرے گا؛ لیکن اگر دل کی محبت غالب ہو جائے اور اللہ کی محبت کمزور ہو تو پھر دل ہی محبوب بن جاتا ہے اور ایسی حالت میں انسان گناہوں سے خود کو نہیں بچا سکتا۔ لہٰذا گناہوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت سب سے زیادہ سب پر غالب رہے۔

اے اللہ! ہمیں تقویٰ نصیب فرما! ہمیں ہر حال میں اپنا خوف عطا کر اور اپنی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق دے! آمین یا رب العالمین۔

* * *

اولاد ایک امانت

از: مولانا محمد توقیر رحمانی
لیکچرر: مرکز المعارف، ممبئی

دنیا کی تیز رفتار زندگی نے انسان کو بے شمار سہولتیں ضرور عطا کی ہیں؛ لیکن انھیں سہولتوں کے درمیان بعض ایسی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کی اہمیت وقت گزرنے کے ساتھ کم ہونے کے بجائے پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان میں سب سے اہم ذمہ داری اولاد کی تربیت ہے۔ یہ ایسا فریضہ نہیں جسے دولت، شہرت یا مصروفیت کے بہانے کسی دوسرے کے سپرد کیا جاسکے؛ کیونکہ ایک انسان کا کردار کسی ادارے سے پہلے گھر میں تشکیل پاتا ہے۔ جس گھر میں اخلاق، احترام اور محبت کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے، وہاں سے معاشرے کو ایسے افراد ملتے ہیں جو دوسروں کے لیے سہارا بنتے ہیں، اور جہاں تربیت کمزور پڑ جائے، وہاں تعلیم، آسائش اور ترقی بھی کردار کی کمی پوری نہیں کرسکتیں۔

انسان جب ایک ننھے بچے کو دیکھتا ہے تو بظاہر وہ کمزور، بے بس اور دوسروں کا محتاج دکھائی دیتا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی ننھے وجود کے اندر مستقبل کا پورا معاشرہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہی بچہ آگے چل کر کسی خاندان کا سربراہ، کسی قوم کا رہنما، کسی ادارے کا ذمہ دار یا کسی گھر کا محافظ بنتا ہے۔ اگر ابتدا میں اس کی شخصیت کی بنیاد درست رکھی جائے تو اس کی پوری زندگی استقامت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے؛ لیکن اگر بنیاد میں ہی دراڑ رہ جائے تو بعد کی مضبوط سے مضبوط تعمیر بھی ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔ جس طرح ٹیڑھی رکھی ہوئی پہلی اینٹ پوری دیوار کو ٹیڑھا کردیتی ہے، اسی طرح بچپن کی ایک بڑی تربیتی غفلت پوری شخصیت پر اثر انداز ہوجاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بچپن کو زندگی کا سب سے حساس دور کہا جاتا ہے۔ اس عمر میں الفاظ سے زیادہ رویے سکھاتے ہیں، نصیحتوں سے زیادہ ماحول اثر ڈالتا ہے اور حکم سے زیادہ عملی نمونہ دل میں جگہ بناتا ہے۔ اگر گھر کے اندر احترام، شکر گزاری، تحمل اور خوش اخلاقی کا ماحول ہو تو یہی صفات بچے کی طبیعت

کا حصہ بن جاتی ہیں؛ لیکن اگر ہر وقت سختی، بدتمیزی، غصہ اور بے ادبی کا ماحول ہو تو یہی رویے اس کے مزاج میں رچ بس جاتے ہیں۔ انسان وہی بنتا ہے جسے وہ روز دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے۔

اولاد درحقیقت ایک امانت ہے اور امانت کا تقاضا صرف اس کی حفاظت نہیں؛ بلکہ اسے اس حال میں لوٹانا بھی ہے کہ وہ اپنی اصل قدر و قیمت برقرار رکھے۔ اگر کسی شخص کو قیمتی چیز امانت میں دی جائے تو وہ اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے؛ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کی جسمانی آسائش پر تو بے شمار وسائل خرچ کر دیتے ہیں؛ مگر ان کے اخلاق، عادات اور کردار کی حفاظت کو ثانوی حیثیت دے دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسم تو طاقتور ہو جاتا ہے مگر شخصیت اندر سے کھوکھلی رہ جاتی ہے۔

موجودہ ڈیجیٹل دور نے تربیت کے میدان کو پہلے سے کہیں زیادہ حساس بنا دیا ہے۔ آج بچے کے ہاتھ میں موجود ایک چھوٹی سی اسکرین اسے لمحوں میں پوری دنیا سے جوڑ دیتی ہے۔ یہ ذریعہ علم بھی بن سکتا ہے اور گمراہی کا راستہ بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے ساتھ رہنمائی موجود ہے یا نہیں۔ اگر والدین صرف موبائل چھین لینے کو تربیت سمجھیں تو مسئلہ حل نہیں ہوگا؛ کیونکہ پابندی وقتی اثر رکھتی ہے، جب کہ صحیح سوچ پوری زندگی رہنمائی کرتی ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ بچے کے اندر اتنی فکری پختگی پیدا کی جائے کہ وہ اچھے اور برے کے درمیان خود فرق کرنے کے قابل ہو جائیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کانوں سے کم اور آنکھوں سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ والدین اگر خود بزرگوں کا احترام کریں، نرم لہجے میں گفتگو کریں، وعدے کی پابندی کریں اور دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کریں تو یہی تعلیم خاموشی سے بچوں کے دل میں منتقل ہو جاتی ہے؛ لیکن اگر زبان احترام کا درس دے اور عمل اس کے برعکس ہو تو بچے الفاظ کو نہیں؛ بلکہ کردار کو اختیار کرتے ہیں؛ اسی لیے بہترین تربیت وہ ہے جو نصیحت سے پہلے عملی نمونے کی صورت میں سامنے آئے۔

چند روز قبل سفر کے دوران ایک ایسا منظر دیکھنے کو ملا جس نے دل میں کئی سوالات پیدا کر دیے۔ صبح کا وقت تھا۔ ایک ضعیف والد نہایت محبت سے اپنی جوان بیٹی کو ناشتے کے لیے جگانے آیا۔ ان کی آواز میں شفقت تھی، مگر جواب میں بیٹی نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا: ''مجھے ناشتہ نہیں کرنا، بار بار کیوں مجھے پریشان کر رہے ہیں؟'' الفاظ مختصر تھے؛ لیکن ان کے اندر چھپی بے زاری بہت گہری تھی۔

سفر ابھی جاری تھا اور پورے راستے اسی چڑچڑے پن اور سخت مزاجی کا بار بار مشاہدہ ہوتا رہا۔ اس ایک واقعے نے یہ احساس مزید مضبوط کر دیا کہ اولاد کو صرف تعلیم یافتہ بنانا کافی نہیں؛ بلکہ ادب، احترام، خوش مزاجی اور نرم دلی سکھانا اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے؛ کیونکہ علم انسان کو قابل بنا سکتا

ہے، مگر اخلاق ہی اسے محبوب بناتے ہیں۔ یہ واقعہ کسی ایک گھر کی کہانی نہیں بلکہ بدلتے ہوئے معاشرے کا آئینہ ہے۔ جب بچوں کو ہر سہولت تو ملتی ہے مگر صبر نہیں سکھایا جاتا، ہر خواہش پوری کی جاتی ہے مگر شکر ادا کرنا نہیں سکھایا جاتا، ہر کامیابی کی تعریف ہوتی ہے مگر بڑوں کی عزت کا شعور پیدا نہیں کیا جاتا، تو شخصیت کے اندر ایک ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے جو بعد میں تعلقات کو کمزور کر دیتا ہے۔ پھر والدین حیران ہوتے ہیں کہ اتنی محنت کے باوجود اولاد کے دلوں میں وہ محبت اور احترام کیوں پیدا نہ ہوسکا جس کی وہ امید رکھتے تھے۔

تربیت کا سب سے بڑا امتحان اس وقت نہیں ہوتا جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے؛ بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود فیصلہ کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ بچپن میں والدین کا حکم بچے کو خاموش کرا سکتا ہے؛ لیکن جوانی میں صرف وہی تربیت اسے درست راستے پر قائم رکھتی ہے جو برسوں کے کردار، محبت اور حکمت سے اس کے اندر راسخ ہوچکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت کا اصل مقصد وقتی اطاعت حاصل کرنا نہیں؛ بلکہ ایسی شخصیت تیار کرنا ہے جو تنہائی میں بھی صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرسکے۔ قدرت کا ایک اٹل قانون ہے کہ ہر عمل اپنے انجام کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ کسان اگر بیج بوتے وقت غفلت کرے تو فصل پکنے کے بعد افسوس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح والدین اگر تربیت کے ابتدائی مرحلے میں کوتاہی کریں تو وقت گزرنے کے بعد صرف شکایتیں رہ جاتی ہیں۔ جو بچے بچپن میں والدین کی محبت کے ساتھ ان کا ادب بھی سیکھتے ہیں، وہ جوان ہوکر ان کی لاٹھی بنتے ہیں، اور جو صرف اپنی خواہشات کے عادی بنا دیے جاتے ہیں، وہ اکثر والدین کی ضرورت کے وقت خود کو ان سے دور کرلیتے ہیں؛ اس لیے تربیت کا ہر لمحہ درحقیقت مستقبل میں ہونے والی ملاقات کی تیاری ہے؛ انسان اپنی ہی محنت کا پھل کاٹتا ہے۔

والدین کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہر بچہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ جس طرح ہر زمین کی ساخت مختلف ہوتی ہے، اسی طرح ہر دل کا مزاج بھی الگ ہوتا ہے۔ کہیں محبت زیادہ اثر کرتی ہے، کہیں نرمی کے ساتھ سمجھانا اور کہیں خاموشی بھی بہترین نصیحت بن جاتی ہے۔ کامیاب مربی وہ ہے جو صرف حکم دینا نہیں جانتا؛ بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس دل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ سختی اگر محبت سے خالی ہو تو بغاوت پیدا کرتی ہے، اور محبت اگر اصولوں سے خالی ہو تو بے راہ روی کو جنم دیتی ہے۔ اعتدال ہی وہ راستہ ہے جو شخصیت کو مضبوط بناتا ہے۔

اولاد کی بھی ذمہ داری معمولی نہیں۔ انسان اگر چند لمحوں کے لیے اپنی زندگی پر نظر ڈالے تو اسے محسوس ہوگا کہ اس کے وجود کی ہر سہولت کے پیچھے والدین کی بے شمار قربانیاں پوشیدہ ہیں۔ جب وہ

چل نہیں سکتا تھا تو کسی نے اسے اٹھایا، جب بول نہیں سکتا تھا تو کسی نے اس کی ضرورت سمجھی، جب وہ بیمار پڑا تو کسی نے اپنی نیند قربان کی، جب وہ کمزور تھا تو کسی نے اپنی طاقت اس پر خرچ کی۔ یہی وہ احسانات ہیں جن کا بدلہ دنیا کی کوئی دولت ادا نہیں کرسکتی؛ اس لیے جب والدین بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ جائیں، ان کی قوت جواب دے جائے اور انہیں سہارا درکار ہو، تو یہی اولاد ان کے لیے رحمت کا سایہ بنے۔ یہی انسانیت ہے، یہی شرافت ہے اور یہی زندگی کا انصاف بھی۔ افسوس اس وقت ہوتا ہے جب انسان اپنے والدین کی قدر اس وقت کرتا ہے جب ان کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوچکی ہوتی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی محرومی یہ نہیں کہ انسان کسی قیمتی چیز سے محروم ہوجائے؛ بلکہ یہ ہے کہ اسے اپنے محسن کی قدر کرنے کا موقع ملا ہو اور وہ اسے ضائع کردے۔ والدین کا وجود گھر میں صرف دو افراد کا وجود نہیں؛ بلکہ وہ ایک ایسی چھاؤں ہیں جس کی ٹھنڈک کا احساس اکثر اس وقت ہوتا ہے جب وہ سر سے اٹھ چکی ہوتی ہے۔

ایک صالح معاشرہ قانون سے پہلے گھروں میں بنتا ہے۔ اگر گھروں میں احترام، رحم، ذمہ داری اور حسنِ اخلاق کی بنیاد مضبوط ہو تو معاشرے کو امن دینے کے لیے زیادہ قوانین کی ضرورت نہیں پڑتی؛ لیکن جب گھر تربیت سے خالی ہوجائیں تو پھر ادارے، نصیحتیں اور سزائیں بھی کردار کی اس کمی کو پوری نہیں کرسکتیں جو بچپن میں پیدا ہوچکی ہوتی ہے؛ اس لیے ہر والدین کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صرف ایک بچے کی پرورش نہیں کررہے؛ بلکہ آنے والے معاشرے کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی نہیں کہ بچوں کو صرف کامیاب انسان بنایا جائے؛ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ انھیں اچھا انسان بنایا جائے۔ ایسی کامیابی جو انسان کو والدین سے دور کردے، اس کی زبان سے احترام چھین لے، اس کے دل سے رحم ختم کردے اور اس کے مزاج میں تکبر پیدا کردے، وہ کامیابی نہیں؛ بلکہ ایک خوبصورت ناکامی ہے۔ حقیقی کامیابی وہ ہے جس میں علم کے ساتھ حلم، ترقی کے ساتھ تواضع، طاقت کے ساتھ رحم اور آزادی کے ساتھ ذمہ داری بھی موجود ہو۔

آخر میں ہر والدین اور ہر اولاد کو ایک لمحے کے لیے اپنے دل سے یہ سوال ضرور کرنا چاہیے کہ اگر آج گھر کا ماحول آئندہ نسل کے لیے نمونہ بن جائے تو کیا اس پر فخر کیا جاسکے گا؟ اگر جواب ہاں میں ہے، تو تبدیلی کا بہترین وقت کل نہیں؛ بلکہ آج ہے۔ کیونکہ بچے نصیحتوں سے کم اور زندگی کے مناظر سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ جو محبت، احترام اور حسنِ اخلاق آج ان کے دلوں میں بویا جائے گا، کل وہی سایہ بن کر والدین پر لوٹے گا۔ تربیت کا ہر اچھا عمل دراصل مستقبل میں اپنے ہی لیے روشنی جمع کرنا ہے، اور یہی روشنی خاندانوں کو بکھرنے سے بچاتی، معاشروں کو سنوارتی اور نسلوں کو عظمت عطا کرتی ہے۔

گفتگو کا سلیقہ

ازقلم: مولانا فضیل اختر قاسمی بھیروی
خادم التدریس دارالعلوم رحیمیہ پیلیر آندھراپردیش

انسان کی زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر چھوٹی معلوم ہوتی ہیں؛ لیکن ان کے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔ انھیں میں ایک ''زبان'' بھی ہے۔ زبان کا نہ کوئی وزن ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے؛ لیکن یہی زبان کبھی دلوں کو جوڑ دیتی ہے اور کبھی برسوں پرانے رشتوں کو توڑ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے عقائد اور اعمال کے ساتھ ساتھ اس کی گفتگو اور طرزِ کلام پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

(علامہ محمد اقبال)

آج ہم ایسے دور میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں الفاظ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب آدمی کی بات چند لوگوں تک پہنچتی تھی؛ لیکن آج سوشل میڈیا کے ذریعے ایک جملہ ہزاروں؛ بلکہ لاکھوں لوگوں تک پہنچ جاتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جتنا ترقی کا سفر تیز ہوا ہے، اتنی ہی زبان کی تلخی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اختلافِ رائے کو دشمنی سمجھ لیا گیا ہے، تنقید کو تذلیل بنا دیا گیا ہے اور گفتگو کے آداب کو اکثر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم نے گفتگو کے بارے میں نہایت خوبصورت اصول عطا کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا''

ترجمہ: ''لوگوں سے اچھی بات کہو۔''

غور کیجیے! قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ صرف دوستوں سے اچھی بات کہو؛ بلکہ عمومی حکم دیا کہ تمام لوگوں سے بھلے انداز میں گفتگو کرو۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس تعلیم کی بہترین عملی تفسیر ہے۔آپ ﷺ نے کبھی کسی کو بدزبانی نہیں کہا،کبھی گالی نہیں دی اور نہ ہی سخت لہجے کو اپنی عادت بنایا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:”مَن كانَ يُؤْمِنُ باللّٰهِ واليومِ الآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ“

ترجمہ:”جواللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو،اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔“

یہ حدیث ہماری روزمرہ زندگی کے لیے ایک مکمل ضابطۂ اخلاق ہے۔ بہت سے جھگڑے، بہت سی ناراضگیاں اور بہت سی دشمنیاں صرف اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان سوچے بغیر بول دیتا ہے۔ایک تلخ جملہ بعض اوقات ایسا زخم دے جاتا ہے جو برسوں بعد بھی نہیں بھرتا۔گھر ہو یا دفتر، مدرسہ ہو یا بازار، دوستوں کی مجلس ہو یا سوشل میڈیا کا پلیٹ فارم، ہر جگہ الفاظ اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ایک نرم جملہ ٹوٹے ہوئے دل کو سہارا دے سکتا ہے اور ایک کڑوا جملہ ہنستے بستے ماحول کو خراب کرسکتا ہے۔کتنے ہی خاندان معمولی باتوں سے شروع ہونے والے تلخ الفاظ کی وجہ سے بکھر گئے، کتنی ہی دوستیاں سخت لہجوں کی نذر ہوگئیں اور کتنے ہی رشتے صرف زبان کی بے احتیاطی سے ختم ہوگئے۔خاص طور پر سوشل میڈیا نے اس مسئلے کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔لوگ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر، سمجھے بغیر اور سوچے بغیر تبصرے کر دیتے ہیں۔بعض اوقات ایک پوسٹ کے نیچے لکھا گیا ایک جملہ کسی کی عزت، دل اور جذبات کو بری طرح مجروح کر دیتا ہے۔افسوس یہ ہے کہ ہم الفاظ لکھتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ سامنے بھی ایک انسان ہے جس کے احساسات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ زبان انسان کے کردار کا آئینہ ہوتی ہے۔جس کے دل میں نرمی، محبت اور خیر خواہی ہوتی ہے،اس کی گفتگو میں بھی مٹھاس ہوتی ہے۔اور جس کے دل میں غصہ، حسد اور نفرت بھری ہو،اس کے الفاظ میں بھی سختی نمایاں ہوجاتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی زبان کا محاسبہ کریں۔ بولنے سے پہلے سوچیں کہ ہماری بات کسی کے دل کو خوش کرے گی یا دکھائے گی؟ کسی کا حوصلہ بڑھائے گی یا توڑے گی؟ کسی کو قریب لائے گی یا دور کر دے گی؟

یاد رکھیے! محبت کے شہر تلواروں سے کم اور کڑوے الفاظ سے زیادہ اجڑتے ہیں؛ اسی لیے دانا لوگ کہتے ہیں کہ زخمِ تلوار بھر سکتا ہے،لیکن زخمِ زبان بعض اوقات عمر بھر نہیں بھرتا۔

آج ہمارے معاشرے میں بہت سے مسائل کی جڑ صرف یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو سننے کے بجائے ایک دوسرے پر بولنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص اپنی بات منوانا چاہتا ہے؛ لیکن دوسروں کے

جذبات اور احساسات کا خیال کم ہی رکھا جاتا ہے۔ گھروں میں میاں بیوی کے درمیان اختلافات ہوں، والدین اور اولاد کے تعلقات ہوں یا دوستوں اور رشتہ داروں کے معاملات، اکثر جھگڑوں کے پیچھے تلخ الفاظ اور سخت لہجے کارفرما ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غصے کے چند لمحے بعض اوقات برسوں کی محبت کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ انسان جب غصے میں ہوتا ہے تو وہ ایسے الفاظ کہہ جاتا ہے جن پر بعد میں اسے خود شرمندگی ہوتی ہے؛ لیکن افسوس کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں آتے۔ معافی مانگ لی جائے تو بھی بعض زخم دلوں میں باقی رہ جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده‘‘

ترجمہ: ’’مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔‘‘

اس حدیث میں زبان کو ہاتھ سے پہلے ذکر کیا گیا ہے؛ کیونکہ بہت سی مرتبہ زبان کا نقصان ہاتھ کے نقصان سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ چوٹ جسم پر لگتی ہے اور وقت کے ساتھ بھول جاتی ہے؛ لیکن بعض الفاظ روح پر لگتے ہیں اور مدتوں یاد رہتے ہیں۔

سوشل میڈیا کے اس دور میں زبان کی حفاظت پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگئی ہے۔ آج ہماری تحریریں بھی ہماری زبان کا حصہ ہیں۔ فیس بک، واٹس ایپ، ٹویٹر، انسٹاگرام اور دیگر پلیٹ فارمز پر لکھا جانے والا ہر لفظ ہمارے اخلاق اور تربیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسوس کہ بعض لوگ اختلاف کو گالی، تنقید کو تضحیک اور بحث کو دشمنی میں بدل دیتے ہیں؛ حالانکہ مہذب انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود احترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اچھے الفاظ بولنے کے لیے مال و دولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک مسکراہٹ، ایک دعائیہ جملہ، ایک حوصلہ افزا بات اور ایک نرم لہجہ کسی کے دل میں امید پیدا کرسکتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو زندگی کی مشکلات سے تھکے ہوئے ہوتے ہیں، اور آپ کے دو اچھے جملے ان کے لیے نئی ہمت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنے گھروں کو خوش گوار، اپنے معاشرے کو پرامن اور اپنے تعلقات کو مضبوط بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زبان کی اصلاح سے آغاز کرنا ہوگا۔ بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالنی ہوگی، غصے کے وقت خاموشی اختیار کرنی ہوگی، دوسروں کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا اور ہمیشہ خیرخواہی کے جذبے کے ساتھ گفتگو کرنی ہوگی۔

آیئے! آج ہم یہ عہد کریں کہ ہماری زبان نفرت نہیں محبت پھیلائے گی، دل نہیں توڑے گی؛ بلکہ جوڑے گی، مایوسی نہیں؛ بلکہ امید پیدا کرے گی، اور اختلاف کے باوجود اخلاق و شرافت کا دامن

کبھی نہیں چھوڑے گی۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ محبت کے محل اینٹوں اور پتھروں سے نہیں؛ بلکہ حسنِ اخلاق، نرم گفتاری اور خلوص کے ستونوں پر قائم ہوتے ہیں، اور جب زبان کی تلخی بڑھ جاتی ہے تو پھر واقعی کڑوے لفظوں سے اجڑتے ہیں محبت کے نگر۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ“

ترجمہ: ”قیامت کے دن مومن کے میزان میں حسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔“

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے الفاظ کو خیر و محبت کا ذریعہ بنائیں، اپنی گفتگو کو شائستگی کا آئینہ بنائیں اور اپنے لہجوں میں ایسی مٹھاس پیدا کریں جو دلوں کو جوڑے، نفرتوں کو مٹائے اور معاشرے میں اخوت و محبت کی فضا قائم کرے۔ یہی حسنِ اخلاق کا تقاضا ہے، یہی سنتِ نبوی ﷺ کا پیغام ہے اور یہی ایک مہذب اور پُرامن معاشرے کی بنیاد ہے۔

* * *

حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ اور ان کی فقہی خدمات

از: مولانا محمد اللہ خلیلی قاسمی
صغیر کالونی، محلّہ خانقاہ، دیوبند

شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی برصغیر کے ان ممتاز اہلِ علم میں سے تھے جن کی شخصیت محض کسی ایک علمی فن یا منصب کی نمائندہ نہیں؛ بلکہ علم، تدریس، انتظام اور تربیت کے کئی دائروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ دارالعلوم دیوبند کے علمی و تعلیمی ماحول میں گزرا، جہاں انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصے تک تدریسی، انتظامی اور علمی خدمات انجام دیں اور اپنی ذات کو مکمل طور پر تعلیم و تعلم کے لیے وقف کر دیا۔ وہ دن رات علم کی خدمت میں مشغول رہتے تھے؛ درس کی تیاری، مطالعہ، طلبہ کی رہنمائی و تربیت اور علمی سرگرمی ان کے معمولاتِ زندگی کا حصہ تھے، یہاں تک کہ تعلیم و تدریس ان کی شخصیت کا مرکزی حوالہ بن گئی۔ ان کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی ہمہ وقتی وابستگی اور بے لوثی تھی، نہ شہرت کی طلب، نہ منصب کی خواہش؛ بلکہ ایک خاموش، مسلسل اور مخلص خدمت، جس نے دارالعلوم کے علمی ماحول پر دیرپا اثرات چھوڑے۔ اس طرح شیخ الادب کا تعارف ایک ایسے ہمہ جہت عالم اور فنا فی التدریس معلم کے طور پر سامنے آتا ہے جس کی زندگی علم کے لیے وقف تھی۔

برصغیر کے علمی و دینی افق پر حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ کی شخصیت کثرتِ تصانیف یا مناصب کی بنا پر نہیں؛ بلکہ ان کے علمی ذوق، رجال سازی اور تدریسی و فقہی اثرات کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ انھیں اہلِ علم بجا طور پر شیخ الادب والفقہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ لقب محض اعزازی نہیں؛ بلکہ ان کی علمی زندگی کے دو بنیادی اور باہم مربوط دائروں ادب اور فقہ کا جامع عنوان ہے۔ حضرت شیخ الادبؒ کے ادبی ورثہ کے سلسلے میں عموماً لوگوں کو واقفیت ہے اور نظم و نثر، تصانیف و حواشی کی شکل میں بہت کچھ مطبوعہ مواد موجود ہے؛ لیکن آپ کے دوسرے اختصاص ''فقہ'' کے متعلق جو

کچھ دستیاب ہے وہ صرف چند حواشی وتعلیقات ہیں۔ یہ مقالہ حضرت شیخ الادبؒ کی فقہی ورثہ اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند میں موجود ان کے فتاوی کے خزانے کی بازیافت کی ایک ادنی سی کوشش ہے۔

شیخ الادب اور دارالعلوم

حضرت شیخ الادبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں مدرس، منتظم، مفتی وغیرہ حیثیتوں سے چار دہائیوں سے زیادہ مدت گزاری۔ اس دوران وہ دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی، نائب شیخ الحدیث اور نائب ناظم تعلیمات بھی رہے۔ انتظامی امور میں بھی آپ کی قابلیت مسلّم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارۂ اہتمام کے ذریعہ آپ کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام کے عہد صدارت میں ۱۳۵۷ھ میں نائب ناظم تعلیمات بنائے گئے اور (درمیان میں ۱۳۶۴ھ تا ۱۳۶۷ھ کے علاوہ) تاحیات اس عہدہ پر قائم رہے۔ حضرت مولانا مدنیؒ کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف پڑھانے کا بھی موقع ملا۔ دارالاقامہ کی ذمہ داریاں بھی آپ سے متعلق رہیں۔ غرض آپ ایک بے نظیر استاذ، منتظم، متبحر عالم دین اور جامع شخصیت تھے۔ دارالعلوم میں آپ کی علمی وانتظامی خدمات کا دور چوالیس برس تک ممتد رہا۔

فقہ وادب آپ کا خاص فن تھا، جس کی مہارت مشہور زمانہ ہے۔ آپ جب شروع میں دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نورالایضاح وغیرہ آپ کو دی گئیں؛ مگر آپ کے درس نے بالآخر وہ مقبولیت حاصل کی کہ ''شیخ الادب والفقہ'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ عمر کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پایہ کتابیں پڑھائیں۔ حضرت مولانا مدنیؒ کی عدم موجودگی میں متعدد مرتبہ بخاری شریف بھی پڑھائی۔ تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت اور نگرانی کا ان میں خاص ذوق تھا، جس سے طلبہ کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ آپ کی پابندیٔ اوقات ضرب المثل تھی اور اوقات درس کی پابندی میں اپنی نظیر آپ تھے، یہاں تک کہ بعض اساتذۂ دارالعلوم نے درس میں وقت کی پابندی کا سبق حضرت شیخ الادب ہی سے سیکھا۔ بے نفسی اور تواضع میں اپنی مثال آپ تھے۔ بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں کبھی آپ کو عار نہ ہوا تھا، ترمذی و بخاری کے درس کے ساتھ بچوں کو میزان الصرف، علم الصیغہ، نورالایضاح وغیرہ بھی پڑھاتے تھے۔

حیدرآباد میں قیام

نظام دکن آصف جاہ سابع امیر عثمان علی خان بہادر کی طرف سے ۱۳۳۹ھ میں دارالعلوم دیوبند

کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو ریاست حیدرآباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کا صدر مفتی بنانے کی پیشکش کی گئی جسے حضرات اکابر کے مشورے سے ریاست دکن کے ساتھ دارالعلوم کے تعلقات کے پیش نظر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے قبول فرمالیا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ اس عظیم دینی منصب پر تقریباً تین سال فائز رہے۔

حضرت مہتمم صاحبؒ کو اپنی ضعیف العمری کے سبب ''صدر مفتی'' کے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں نائب کی ضرورت تھی۔ اس وقت حضرت شیخ الادبؒ کو دارالعلوم میں استاذ ہوئے تقریباً نو سال گذر چکے تھے اور ان کی تدریسی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور ہو چکا تھا۔ چناں چہ قرعۂ فال انھیں کے نام نکلا اور حضرات اکابر کے اصرار پر اس ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے ساتھ حیدرآباد تشریف لے گئے۔ وہاں وہ ریاست کے تمام امور متعلقہ دارالافتاء انجام دینے لگے۔ حضرت شیخ الادبؒ نے حضرت مہتمم صاحبؒ کی پورے طور پر علمی وانتظامی معاونت کی اور حضرت مہتمم صاحبؒ بھی ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ حضرت مہتمم صاحبؒ نے ''نظام دکن'' سے سفارش کی اس طرح آپ کے لیے پچاس روپیہ ماہوار تاحینِ حیات وظیفہ مقرر ہوگیا۔ حضرت شیخ الادبؒ اس سلسلے میں تقریباً ایک سال حیدرآباد میں مقیم رہے۔ (روداد سالانہ مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند بابت سن ۱۳۴۰ھ ہجری، ص ۶ تا ۹، ۳۳؛ محمود الروایہ حاشیہ شرح نقایہ، مکتبہ اعزازیہ دیوبند، ص: ز)

ریاستِ حیدرآباد کے سابقہ نظام میں اسلامی طرز پر دارالقضاء کا محکمہ قائم تھا جس میں ممالک محروسہ کے شرعی معاملات پیش ہوکر طے ہوتے تھے۔ افتاء کا منصب بھی سرکاری طور پر قائم تھا، جو نہایت اہم اور حساس شعبہ تھا۔ عدالت عالیہ میں صدر مفتی کا عہدہ تھا جس کا کام دینی مسائل میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ قتل وقصاص کے مقدمات میں شریعت کے مطابق فتوی دینا تھا۔ عدالت عالیہ کے فیصلے اور سزائے موت کا انحصار مفتی کے فتوی پر ہوتا تھا۔ اگر چہ یہ عہدہ عدالت عالیہ کے چیف جسٹس کے مماثل تھا؛ مگر اس لحاظ سے کہ یہ ایک خالص مذہبی وشرعی منصب ہے زیادہ ممتاز اور باعظمت سمجھا جاتا تھا۔ (تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص ۲۵۹)

بہر حال، صدر مفتی دکن کی نیابت جیسے عظیم منصب پر فقہی خدمات کی انجام دہی کے لیے حضرت شیخ الادبؒ کا انتخاب جہاں ان کی علمی وفقہی صلاحیت ولیاقت پر شاہد عدل ہے، وہیں آپ پر حضرات اساطین و اکابر کے اعتماد واعتبار کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ حیدرآباد میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے جو فتاوی لکھے گئے اس کی نقل دارالعلوم وقف کے ذمہ داران نے حاصل کی

ہے اور حضرتؒ کی سوانح 'عکس احمد' میں اس کے کچھ نمونے شامل کیے ہیں؛ لیکن ان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ کون کون سے فتاوی حضرت شیخ الادبؒ کے لکھے ہوئے ہیں۔ (عکس احمد، ص ۲۳۸)

فقہی تعلیقات وتالیفات

حضرت شیخ الادبؒ اعلی درجے کے مدرس ومربی اور منتظم تھے۔ انھوں نے بنیادی طور پر تصنیف وتالیف کی طرف توجہ نہیں کی؛ لیکن طلبہ واساتذہ کی رہ نمائی اور سہولت کے پیش نظر متعدد کتابوں کے حواشی وتعلیقات تحریر فرمائیں۔ یہ دنیائے علم پر حضرت شیخ الادبؒ کا قابل ذکر وگراں قدر احسان ہے کہ انھوں نے درس نظامی کی ان کتابوں کا جن کی عبارت کے اختصار، ابہام، اغلاق یا مضامین و مطالب کی دقت وباریکی کی وجہ سے طلبہ کے لیے سمجھنا اور معلمین کے لیے سمجھانا مشکل تھا، اور اس کے باوجود درسی کتابیں جن کے قابل اعتبار اور سہل الماخذ حواشی موجود نہ تھے، بڑی کاوش وتحقیق کے بعد ان کے حواشی لکھے اور اپنے طویل تدریسی تجربہ کی بنا پر ہر حیثیت سے ان کو اس درجہ سہل اور عام فہم بنا دیا کہ ذی استعداد طلبہ کے علاوہ ادنی صلاحیت واستعداد کے طالب علم بھی سہولت کے ساتھ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

حضرت شیخ الادبؒ کے ان حواشی کی عام مقبولیت اور پسندیدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک فن کے مسلسل مطالعہ اور اس فن کی متعلقہ کتابوں کی متواتر تدریس نے حضرت مولانا کو اس کے ناقابل فہم اور مشکل مقامات سے خوب واقف کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ طالب علم کی نفسیات اور اس کی طلب سے بھی اچھی طرح واقف تھے؛ اس لیے حاشیہ کے لیے ان کا قلم اٹھا تو ان ناقابل فہم مقامات کو جن پر دوسرے محشی اپنے مخصوص تسامح سے کام لیتے ہوئے گزر جاتے ہیں، مولانا نے انھیں مکمل طور پر حل کیا۔ مولانا کے یہ حواشی اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے طبقۂ اول کے علماء کے یہاں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اور اکثر مدارس کے معلّمین کو وہ تدریس کے وقت میں مولانا ہی کے حواشی سے استفادہ کرتے ہیں۔ (حیات اعزاز، ص ۶۵)

ذیل میں حضرت شیخ الادبؒ کی فقہی تالیفات وتعلیقات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۱) حاشیہ نورالایضاح (فارسی وعربی)

آپ نے سب سے پہلے نورالایضاح کا حاشیہ لکھا۔ یہ حاشیہ اولاً فارسی میں لکھا گیا تھا، اس کے بعد اسی کتاب کا دوسرا حاشیہ آپ نے عربی میں تحریر کیا۔ مولانا کے یہ دونوں حواشی بے حد مقبول ہوئے اور علما وطلبہ دونوں طبقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے گئے۔ پہلا ایڈیشن 'مطبع قاسمی' سے اور

دوسرا ایڈیشن ’کتب خانہ انصاریہ‘ سے شائع ہوا۔

افضل المدارس شاہجہانپور کے قیام کے زمانہ میں حضرت شیخ الادبؒ کو فقہ کی مشہور کتاب ’’کنزالدقائق‘‘ کے حاشیہ کا خیال ہوا تھا؛ لیکن بعض اسباب وموانع کی بنا پر مولانا اپنے اس ارادہ کی تکمیل نہ کر سکے۔ افضل المدارس سے ترک تعلق کے بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوکر آئے تو ایک مجلس میں انھوں نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا، حضرت مولانا عثمانیؒ نے ہمت افزائی کی راہ سے فرمایا کہ اگر ’’کنز‘‘ کا حاشیہ لکھ دیا گیا تو مطبع قاسمی کی جانب سے اس کو شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مولانا نے کنز کے حاشیہ کی تیاری شروع ہی کی تھی کہ دارالعلوم کے مشہور استاذ اور مولانا عثمانی کے قریبی دوست حضرت مولانا سید سراج احمد رشیدی میرٹھیؒ نے، مولانا اعزاز علی صاحب کو بتایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خواہش ہے کہ آپ نورالایضاح کا حاشیہ لکھ دیں، اس وقت تک نورالایضاح کا کوئی حاشیہ موجود نہیں تھا اور مدارس کے طلبہ و اساتذہ کو نورالایضاح کے پڑھنے پڑھانے میں اکثر دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ (تذکرۃ الاعزاز، مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری، ص۶۷-۶۶)

(۲) حاشیہ کنزالدقائق

فقہ کا یہ مشہور ومعروف متن جس کی شرح میں علامہ ابن نجیم نے آٹھ ضخیم جلدیں لکھی ہیں، حضرت شیخ الادبؒ نے اس کا مختصر اور اتنا مفید حاشیہ لکھ دیا کہ اب ابن نجیم کی طویل شرح سے علماء اور طلبہ بے نیاز ہوگئے۔ حاشیہ پر صورت مسئلہ، مختلف فیہ اقوال مذہب حنفیہ کی ترجیحی وجوہات، مشکل مقامات کی تصحیح اور سہل تفسیر اختصار کے ساتھ سب کچھ آ گیا۔ کنز کے حاشیہ کا پہلا ایڈیشن ’مطبع قاسمی‘ سے اور دوسرا ایڈیشن ’کتب خانہ رحیمیہ دیوبند‘ سے شائع ہوا، اور مولانا کے دیگر حواشی کی طرح یہ حاشیہ بھی مقبول عام ہوا۔ (تذکرۃ الاعزاز، ص۶۸-۶۷)

(۳) محمود الروایہ حاشیہ شرح نُقایہ

حضرت شیخ الادبؒ نے محمود الروایہ حاشیہ شرح نقایہ، حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ کی تحریک پر اس وقت لکھا تھا جب حضرت شاہ صاحبؒ نے شرح نقایہ کو شرح وقایہ کی جگہ داخل درس کرانے کی کوشش فرمائی تھی، حضرت مولانا نے حاشیہ کے ساتھ ہندوستان میں شائع شدہ نسخہ کی اغلاط کی بھی اصلاح فرمائی۔ مولانا کا یہ حاشیہ اولاً کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوا۔

شرح نُقایہ دو ہے؛ ایک ملا علی قاری کی اور دوسری شُمُنّی کی، مؤخر الذکر نسخہ قلمی دارالعلوم دیوبند

کے کتب خانہ میں موجود ہے، اول الذکر قازان میں طبع ہوا اور جب ہندوستان میں شائع ہوا تو اس کو قازان ہی کے مطبوعہ نسخہ سے نقل کیا گیا۔ قازان کے مطبوعہ نسخہ میں اغلاط کثرت کے ساتھ موجود تھیں، اس وجہ سے ہندوستان میں شائع شدہ نسخہ میں بھی وہ اغلاط منتقل ہوئیں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب ان کے علوم کا طغرائے امتیاز ہے، حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری مرحوم جو ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے تھے اور ان کی مشہور کتاب مرقاۃ شرح مشکوۃ پر ہمیشہ حضرت شاہ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ کی لمعات اور اشعۃ اللمعات کو ترجیح دیتے؛ مگر اس کتاب یعنی نقایہ کے بے حد مداح تھے، اور اکثر فرماتے کہ: ''قاری نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا''۔ (تذکرۃ الاعزاز، ص۶۹)

راقم السطور کے سامنے مکتبہ اعزازیہ کا یہی نسخہ ہے جو مطبع جامعہ ملیہ دہلی سے طبع ہوئی اور جس پر سن حاشیہ ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء لکھا ہوا ہے۔ اس صاحب حاشیہ نے 'المحشي' کے عنوان سے دو صفحات میں مختصراً اپنے سوانحی احوال اور اپنی تعلیق کردہ کتابوں کی فہرست لکھی ہے۔

(۴) التوضیح الضروری حاشیہ مختصر القدوری

حضرت شیخ الادبؒ نے محمود الروایہ حاشیہ شرح نقایہ کے شروع میں اپنے سوانحی احوال کے ذیل میں فہرست تعلیقات میں مختصر القدوری پر حاشیہ کا ذکر کیا ہے؛ لیکن کسی سوانحی مجموعے میں اس کی تفصیل نہیں ملی۔ بہرحال، کتب خانۂ دارالعلوم میں اکابر کے کمرے میں آپ کی مصنفہ کتابوں کے ذیل میں یہ حاشیہ موجود ہے جس پر ناشر کا نام 'مکتبہ یوسفی دیوبند' درج ہے؛ لیکن تاریخ طباعت درج نہیں۔ بہرحال یہ ۱۳۵۱ھ سے پہلے کا حاشیہ ہے۔ اس حاشیہ میں حضرت شیخ الادبؒ کی طرف سے کوئی تمہید کا مقدمہ شامل نہیں؛ البتہ کتاب کے اخیر میں مصنف کتاب اور طبقات فقہاء پر دو صفحے کا مواد موجود ہے۔ (حیات اعزاز، ص۲۹)

شیخ الادب کا فقہی ذوق اور دارالافتاء کی مسندِ صدارت

ان تعلیقات وحواشی کی اہمیت کے پیش نظر آپ کو بجا طور پر ''شیخ الادب والفقہ'' کہا جاتا تھا۔ حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں کہ علم فقہ میں چوٹی کی کتاب ہدایہ ہے اس کے آخر کے دونوں اجزاء (آخرین) کا درس آپ نے نہایت کامیابی سے چالیس سال تک دیا۔ ہدایہ آخرین ایسی مشکل کتاب کی اہمیت ہر اس اہلِ علم پر واضح ہے جس نے اس کو پڑھایا ہے۔ حضرت شیخ الادب کا درس اس طرح نہیں ہوتا تھا کہ ایک دو صفحے کتاب کے پڑھوائے اور طویل سی تقریر کردی؛ بلکہ ان کا

انداز درس یہ ہوتا تھا کہ وہ علمی مسئلہ کو مسئلہ کی طرح سمجھاتے تھے، اس پر جس قدر اشکال ہوں ان کو ساتھ ساتھ حل کرتے چلے جاتے تھے۔ فن کی گہری باتیں بھی مسئلہ کے ساتھ چلتی تھیں۔ ایسی لگی بندھی تقریر کرتے جس میں بیش بہا مضامین بکثرت ہوتے اور اس سے ادنی واعلی اور متوسط استعداد کے طلبہ سب ہی بہرہ یاب ہوکر اٹھتے۔ یہی وجہ تھی مولانا ممدوح سے پڑھی ہوئی کتاب ہر طالب علم کو محفوظ رہتی تھی اور وہ اس کے پڑھانے پر بے دھڑک قادر ہوتا تھا۔ حضرت مولانا کو لوگ شیخ الادب کہتے اور جانتے ہیں؛ لیکن فقیر (مولانا انظر شاہ) کا یہ خیال ہے کہ وہ ادب پر تو قدرت رکھتے ہی تھے؛ لیکن فقہ سے ان کی طبعی مناسبت نے ان کو اس فن پر جس حد تک قابو یافتہ کر دیا تھا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ مسائل فقہ میں ایسی موشگافیاں کرتے تھے کہ عقل حیران رہ کر مولانا کی ذکاوت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی تھی۔ (تذکرۃ الاعزاز، ص۶۱-۶۰)

یہی وجہ تھی کہ ۱۳۴۰ھ میں آپ کو صدر مفتی دکن حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی نیابت کے لیے حیدرآباد جانا ہوا اور ثانیاً مفتیِ اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے بعد ۱۳۴۶ھ میں آپ کو صدر مفتی کے عہدہ پر نامزد کیا گیا۔ اس عظیم منصب کے لیے حضرت شیخ الادبؒ کا انتخاب بجائے خود ان کی علمی عظمت کا شاہد عدل ہے۔

دارالافتاء میں تقرر آپ کی مرضی کے بالکل خلاف ہوا تھا؛ اس لیے آپ اس عہدۂ جلیلہ پر زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے اور بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی؛ تاہم اکثر دارالافتاء میں جب بھی کوئی اہم مسئلہ آتا، تو اس کے لکھنے میں آپ کی فقہی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی۔ بہر حال یہ انکار عدمِ قابلیت کی وجہ سے نہیں؛ بلکہ احساسِ ذمہ داری اور فتوی دینے میں احتیاط کی وجہ سے تھا جو اجلہ صحابہ اور ائمہ متقنین کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے۔ عمر کے نصف آخر میں فقہ سے اتنا گہرا تعلق ہو چکا تھا کہ یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ آپ کا دل ودماغ ہی فقہ بن چکا تھا؛ چنانچہ آپ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

”ولقد كنت في إبان عمري وعنفوان شبابي مشغوفا بالفنون الأدبية ومبادئ العلوم العربية أباحث عن ضرب زيد عمرا وإنبات الربيع بقلا أخوض في بحار الألفاظ والصفات وأخرج التبن بعد الكسر الصخور والصفاة حتى.......... ندمت على مر الدهور والأيام من غير تحصيل ما كان عمدة في المرام، كأن عمري مضى في المنام وتذكرت ما عملت في أمر الفتوى كدي ووكدي حتى اصفرت وجنتاي وييس

جلدي .... فلبضاعتي المزجاة من الفقه كنت أتتبع الكتب الفقهية واستخرج رواياتها وأقلب أوراق الفتاوى لتمهيد مقاماتها جامعاً بين الجفون والسهاد مفرقا بين العيون والرقاد مواصلا السهر مراعيا النجوم لالتقاط الدرر .... وامتنعت عن الاختلاط والاجتماع مع الناس امتناع دخول الفاء في خبر لعل وليت وعن قولهم كيت وذيت.‘‘ (حیات اعزاز، سید محمد عبدالاحد قاسمی، ص۱۸-۱۷)

اللہ نے آپ کو علم فقہ میں کتنا بلند مقام عطا فرمایا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوریؒ (جو آپ کے اساتذہ میں تھے اور دارالافتاء کے صدر مفتی تھے)، اہم مسائل فقہیہ میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ (حیات اعزاز، ص۲۳-۲۲)

دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند کا نہایت اہم اور مہتم بالشان شعبہ ہے جو بجائے خود ایک مستقل ادارہ ہے۔ قیام دارالعلوم کے بعد ہی عوام الناس نے دینی مسائل دارالعلوم سے رجوع کرنا شروع کردیا تھا، جس کی وجہ سے فتاوی نویسی کی ذمہ داریاں اساتذۂ دارالعلوم ادا کرتے تھے۔ اولاً حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ صدارت تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ مگر جب طلب فتاوی کی تعداد غیر معمولی طور پر بڑھنے لگی تو باضابطہ شعبہ کے قیام کی طرف توجہ ہوئی اور ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ھ میں دارالافتاء کا باضابطہ قیام عمل میں آیا اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اس اہم خدمت کے لیے منتخب ہوئے۔ حضرت ممدوح اپنے زمانے کہ یگانۂ روزگار عالم اور زبردست فقیہ ہونے کے علاوہ زہد وتقوی میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

دارالافتاء سے جو فتاوی طلب کیے جاتے رہے ہیں ان میں روزمرہ کے معمولی مسائل کے علاوہ اہم، پیچیدہ اور غور طلب مسائل، پنچایتوں کے فیصلے، عدالتوں کی اپیلیں اور مختلف الاحکام فتاوی کثرت سے ہوتے ہیں۔ عدالتیں یہاں کے فتاوی کو اہمیت دیتی رہی ہیں۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ ربع صدی سے زیادہ مدت تک مسند افتاء سنبھالی اور ان کی محنت اور خلوص کی وجہ سے دارالافتاء کے فتاوی کو عوام وخواص میں قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ دارالافتاء میں ہمیشہ ایسی شخصیات کو منتخب کیا جاتا رہا جو اپنے علم وتقوی اور فقہی تعمق میں ممتاز تصور کیے جاتے تھے۔ ان شخصیات میں حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور حضرت شیخ الادبؒ کے علاوہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مولانا مفتی سہول بھاگل پوریؒ، مفتی سید مہدی حسن شاہجہاں پوریؒ، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ، مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی

مدظلہ العالی وغیرہم شامل ہیں۔

دارالافتاء کی صدارت کا پہلا دور

بہرحال، حضرت شیخ الادبؒ دارالافتاء کے صدر مفتی کی مسند پر دو بار فائز ہوئے۔ پہلی بار ۱۳۴۶ھ میں جس کا سلسلہ ۱۳۴۹ھ تک جاری رہا۔ اس عہد میں آپ کے ساتھ دارالافتاء میں دو حضرات نے مستقلاً خدمات انجام دیں۔ اول حضرت مولانا مفتی ریاض الدین بجنوریؒ، جو ۱۳۴۷ھ میں دارالافتاء کے مفتی بنائے گئے اور ۱۳۴۹ھ تک فتوی نویسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا قاضی مسعود احمد دیوبندیؒ نائب مفتی تھے،، جو ۱۳۴۶ھ سے ۱۳۸۴ھ تک یعنی تقریباً چالیس سال دارالافتاء میں بہ حیثیت نائب مفتی فتوی نویسی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ حضرت قاضی مسعود احمد دیوبندی، حضرت شیخ الہندؒ کے داماد تھے اور ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں ماخوذ بھی ہوئے تھے۔

بہرحال تین سال تک صدر مفتی کے عہدہ پر رہنے کے بعد ۳۰ رشوال ۱۳۵۰ھ کو انھوں نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی درخواست کی، جسے قبول کرلیا گیا۔ اس کے بعد حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کا دور شروع ہوتا ہے۔ (ریکارڈ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند)

اس عہد کے تین رجسٹر دارالافتاء کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

شمار	سن	سلسلہ فتوی از-تا	تاریخ فتاوی	کیفیت
(۱)	۴۷-۱۳۴۶ھ	1-3586	محرم ۱۳۴۶ھ تا رجب ۱۳۴۷ھ	کچھ فتاوی ہیں، زیادہ تر تصدیقات ہیں۔
(۲)	۴۹-۱۳۴۸ھ	1-2915	محرم ۱۳۴۸ھ تا صفر ۱۳۴۹ھ	کچھ فتاوی ہیں، زیادہ تر تصدیقات ہیں۔
(۳)	۵۳-۱۳۴۹ھ	1-3904		رجسٹر نہیں ملا، صرف یہ تفصیلات ملیں۔

دارالعلوم کے دارالافتاء میں ایک زمانے تک صدر مفتی کا عہدہ تھا جس پر فائز شخصیت کی نگرانی میں اجرائے فتاوی کا عمل انجام دیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالافتاء کی صدارت کے ساتھ حضرت شیخ الادبؒ کے ذمہ تدریسی و انتظامی ذمہ داریاں بھی تھیں؛ اس لیے اس دور میں آپ کے لکھے ہوئے فتاوی کی تعداد بہت کم ہے۔ بہرحال آپ کے اس دور صدارت میں چار ہزار سے زائد فتاوی دارالافتاء سے جاری کیے گئے۔ (دارالعلوم دیوبند کی صدسالہ زندگی، ص ۱۰۰)

رجسٹر نقول فتاوی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اس وقت ایک رجسٹر میں متعدد مفتیان کرام کے فتاوی نقل کیے جاتے تھے۔ نیز، اس وقت مفتی حضرات کی نشان دہی کے لیے کوئی علیحدہ کوڈ نہیں تھا،

بلکہ صرف فتاوی کا سلسلہ نمبر درج کیا جاتا تھا۔ رجسٹروں میں بسا اوقات صرف سوال وجواب نقل کیا گیا ہے، اور مفتی کا نام نہیں لکھا ہوا ہے۔ بہت سے دیگر فتاوی جن میں نام لکھا ہوا ہے ان میں اکا دکا فتاوی حضرت شیخ الادبؒ کے لکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر ایسے فتاوی حضرت قاضی مسعود احمد دیوبندی کے لکھے ہوئے ہیں اور بیشتر پر حضرت شیخ الادبؒ کی تصدیق ثبت ہے۔ ان میں بعض فتاوی حضرت مفتی ریاض الدین بجنوری کے لکھے ہوئے بھی ہیں اور ان میں بھی اکثر پر حضرت شیخ الادبؒ کی تصدیق ہے۔

ان فتاوی کی نقول کو دیکھتے ہوئے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ نقل فتاوی کے طرز و انداز میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ رجسٹر کے شروع میں بہت سے فتاوی کے اخیر میں کسی مفتی کا نام درج نہیں ہے۔ بعد میں نام درج ہے؛ لیکن ہر فتوے کی تصدیق مذکور نہیں ہے، ہاں صرف وہ تصدیقات موجود ہیں جن میں تصدیق کے ساتھ ساتھ توضیحی وتشریحی اضافے ہیں۔

قابل ذکر ہے کہ جن فتاوی پر حضرت شیخ الادبؒ کی تصدیق ہے وہ صرف 'الجواب صحیح' نہیں ہے؛ بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک دو سطر یا کبھی کبھار کئی کئی سطروں کا تبصرہ بھی ہے جس میں زیر بحث فتوے کی تصدیق کے ساتھ ساتھ کسی مسئلے کی تفصیل وتوضیح بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے فتاوی صدر مفتی کی توثیق وتصدیق کے بعد جاری ہوتے تھے؛ لیکن جن فتاوی پر توثیق و تصدیق کے ساتھ کچھ اضافی تبصرہ ہوتا تھا، صرف وہی تبصرے رجسٹروں میں نقل کیے گئے۔

بطور نمونہ کچھ جوابات پر حضرت شیخ الادبؒ کے تبصرے نقل کیے جاتے ہیں:

لفافہ نمبر (۲۷۴۴/۷) تاریخ آمد: ۷/ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ

سوال۲: کیا عیسائی لڑکی سے نکاح کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر عیسائیت کی قائل ہے اور کتاب آسمانی انجیل کی معتقد ہے، تو نکاح بلا کلمہ پڑھانا بھی درست ہے۔ مسعود احمد عفی اللہ عنہ

جواب صحیح ہے، مگر تجربہ نے بتادیا کہ عیسائی عورتیں مسلمانوں سے نکاح کے بعد اس خاندان میں عیسائیت کی تبلیغ کرتی ہیں اور کامیاب ہوجاتی ہیں؛ اس لیے اندرونی فساد کی وجہ سے نامناسب ہے کہ بغیر اطمینان کامل کے عیسائی عورتوں سے نکاح کیا جائے۔ فقط۔ اعزاز علی غفرلہ

لفافہ نمبر (۱۱۲۵) تاریخ آمد: ۲۴/رجب ۱۳۴۸ھ

سوال: احمدی رضائی، دیوبندی دو فریقوں میں جھگڑا ہے، ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے میں متنفر ہیں۔ یہ فیصلہ ٹھہرا ہے کہ جامع مسجد تقسیم کرلی جائے، یہ طریق جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مسجد کی تقسیم اس طرح ناجائز، مسلمانوں میں جھگڑا فساد نہایت قبیح امر ہے: صلوا خلف کل بر و فاجر۔ حدیث شریف کا لحاظ کرتے ہوئے نماز با جماعت ایک دوسرے فریق کے پیچھے ادا کریں: ’الفتنہ أشد من القتل‘ کا لحاظ رکھیں۔ ایک مسجد کو تقسیم کر کے دو جماعت کرنا مکروہ ہے۔ فقط۔ مسعود احمد عفی عنہ

جواب صحیح ہے۔ اور میں اس حیثیت سے کہ ایک دیوبندی جماعت کا فرد ہوں عرض کرتا ہوں کہ دیوبندی صاحبان اس فتنے کو فرو کرنے میں پیش قدمی کریں اور احمد رضا خان کے معتقدین کے پیچھے نماز پڑھ لیں، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بناویں۔ فقط۔ محمد اعزاز علی غفرلہ

لفافہ نمبر (۲۳۷)　　تاریخ آمد: ۱۷رصفر ۱۳۴۸ھ

سوال: ایک شخص نے دوسرے شخص کو کچھ دال اور شوربہ کھلایا بعد میں کہا کہ اس میں خنزیر کا گوشت تھا، ان دونوں کے لیے کیا حکم ہے؟

الجواب: فاسق ہیں، ایسے لوگوں سے تعلقات بالکل قطع کر دیئے جائیں، جب تک توبہ نہ کریں ہرگز ہرگز میل جول نہ کیا جاوے، اول سمجھانا چاہیے، اس کے بعد قطعی تعلقات، مجالست، مکالمت، اور جملہ تعلقات بند کر دیں؛ یہاں تک کہ توبہ پر مجبور ہو جاویں۔ فقط۔ مسعود احمد عفی اللہ عنہ

جواب صحیح ہے، جو لوگ ایسے لوگوں کو سمجھا کر ان سے توبہ کرا دیں گے ان کو بہت زیادہ ثواب ہوگا۔ محمد اعزاز علی غفرلہ

اسی طرح حضرت مفتی ریاض الدین بجنوریؒ کے ایک جواب کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو شادی کی رسوم کے سلسلے میں لکھا گیا تھا:

(۴) لفافہ نمبر (۱۸۶)　　تاریخ آمد: ۶رصفر ۱۳۴۸ھ

جوابات صحیح ہیں؛ چونکہ مسلمان بہت زیادہ تباہ ہو چکے ہیں اور ان کے تباہ کرنے والے اسباب میں اسراف ان تباہی کا قوی سبب ہے؛ اس لیے حتی الامکان تمام رسموں کو چھوڑ دینا بہت ضروری ہے۔ پوری سادگی کے ساتھ ان تقریبات کو انجام دیا جاوے۔ نکاح کے لیے شرعاً کسی وقت کی تعیین نہیں ہے؛ لیکن بلا کسی معقول وجہ سے نابالغی کی حالت میں نکاح مناسب نہیں ہے بعض مرتبہ مشکلات پیش آ جاتی ہیں۔ فقط۔ محمد اعزاز علی غفرلہ

دارالافتاء کی صدارت کا دوسرا دور

دارالافتاء میں صدر مفتی کی حیثیت سے آپ کا دوسرا دور ۱۳۶۴ھ سے شروع ہوتا ہے۔

۱۳۵۰ھ سے ۱۳۶۴ھ یعنی تقریباً پندرہ سال کے درمیان دارالافتاء متعدد حضرات مفتیان، خصوصاً دوصدر مفتیان (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوریؒ) اور دو مفتیان (حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھی اور حضرت مولانا مفتی محمد فاروق انبیٹھویؒ) آتے جاتے رہے؛ چناں چہ پھر ارباب انتظام نے حضرت شیخ الادبؒ کو دوبارہ دارالافتاء کی مسندِ صدارت قبول کرنے پر راضی کرلیا۔ اس طرح ۶؍ربیع الآخر ۱۳۶۴ھ کو آپ کو دوبارہ یہ عہدہ سپرد کیا گیا، جس پر آپ ۱۳۶۸ھ پر فائز رہے۔ مجلس شوریٰ شعبان ۱۳۶۴ھ کی تجویز نمبر ۵ میں دفتر اہتمام کے اس فیصلے کی تائید وتصویب ان الفاظ میں کی گئی:

''تقرر مفتی کا مسئلہ پیش ہوا۔ متعلقہ رپورٹ پڑھی گئی۔ مجلس کے نزدیک مہتمم صاحب اور صدر مدرس صاحب نے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کو دارالافتاء میں عہدۂ مفتی پر لے کر تنظیم افتاء کا جو انتظام کیا ہے وہ باوثوق اور قابلِ اعتماد ہے۔ مجلس مولانا اعزاز علی صاحب کو دائرۂ تدریس سے دارالافتاء میں منتقل کرکے مفتی دارالعلوم قرار دیتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ دارالافتاء دارالعلوم کے لیے اسی پایہ کے مفتی کی ضرورت تھی۔'' (ریکارڈ متعلقہ حضرت شیخ الادبؒ، محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند)

دوسری مرتبہ ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں آپ کو صدر مفتی کا منصب تفویض کیا گیا جس کا سلسلہ ۱۳۷۰ھ تک یعنی تقریباً سات سال تک جاری رہا؛ یعنی دونوں ادوار کی کل مدت مجموعی طور پر تقریباً دس سال ہوتی ہے۔ اکثر طبع شدہ سوانحی مواد میں یہ مدت پانچ سال یا اس سے بھی کم لکھی گئی ہے، جو اس مقالہ میں مندرج تفصیلات کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔

بہرحال، اس دوران حضرت شیخ الادبؒ کے ساتھ پوری مدت حضرت قاضی مسعود احمد دیوبندیؒ نائب مفتی اور حضرت مفتی احمد علی سعیدؒ معین مفتی رہے۔ اسی دوران مسجد قدیم دارالعلوم کی مشرقی جانب کی عمارت کی بالائی منزل پر دارالافتاء کی وسیع اور کشادہ عمارت تیار کرائی گئی جس کا افتتاح ۱۹؍ربیع الآخر ۱۳۶۷ھ/ یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو ہوا۔

اس دور کے کل ۳۷ رجسٹروں میں حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی یا تصدیقات ملتی ہیں؛ لیکن اس زمانے میں بھی ایک ہی رجسٹر میں مختلف مفتیان کرام کے فتاویٰ نقل کرنے کا سلسلہ جاری تھا؛ اس لیے کسی ایک مفتی کے فتاوی کی حتمی تعداد نکالنا ایک مشکل کام تھا؛ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دور کے رجسٹروں میں، تصدیقات وتوثیقات کے علاوہ، حضرت شیخ الادبؒ کے اپنے لکھے ہوئے فتاوی کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا اتنا اندازہ لگالیا گیا کہ کن کن رجسٹروں میں حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کی تعداد

غالب ہےاور کن کن رجسٹروں میں کم ہے۔اسی بنیاد پران تمام ۳۷؍رجسٹروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اولاًان رجسٹروں کی تفصیل ہے جس میں حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کثرت سے ہیں۔ایسے کل ۱۵؍رجسٹر ہیں اور وہ ۱۳۶۴ھ سے ۱۳۶۸ھ کے درمیان کے ہیں،ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

شمار	جلد	سلسلۂ فتوی از-تا	تعداد فتاوی	تاریخ فتاوی	زیادہ تر فتاوی	دیگر مفتیان
(۱)	الف جلد اول	1-334	334	جمادی الاولی ۱۳۶۴ھ تا ربیع الاول ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت قاضی مسعود احمد صاحبؒ وحضرت مفتی احمد علی سعید صاحبؒ
(۲)	ج جلد ثانی	932-1459	528	رمضان ۱۳۶۴ھ تا محرم ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۳)	ب جلد اول	1-580	580	محرم تا جمادی الاولی ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۴)	الف جلد ثالث	713-1072	360	شعبان تا ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۵)	ب جلد ثالث	1-400	400	شوال تا ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۶)	الف جلد ثانی	335-712	378	شعبان تا ذوالحجہ ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۷)	ب	1-724	724	محرم تا جمادی الآخرۃ ۱۳۶۶ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۸)	ج جلد اول	1-772	772	محرم تا ذوالحجہ ۱۳۶۶ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۹)	ب جلد ثانی	775-1461	687	رجب ۱۳۶۶ھ تا ربیع الاول ۱۳۶۷ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۰)	ج جلد ثانی	773-1454	682	جمادی الآخرۃ ۱۳۶۶ھ تا محرم ۱۳۶۷ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۱)	الف جلد اول	1-369	369	محرم تا رجب ۱۳۶۷ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۲)		1-808	808	محرم تا ذوالقعدہ ۱۳۶۷ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۳)	الف جلد اول	1-376	376	محرم تا جمادی الاولی ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۴)	ب جلد ثانی	483-883	400	جمادی الآخرۃ تا شوال ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۵)	الف جلد ثالث	765-1045	280	شوال ۱۳۶۸ھ تا ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=

جن رجسٹروں میں حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کم ہیں اور زیادہ تر ان کی تصدیقات ہیں، وہ بھی تعداد میں ۱۸؍ ہیں۔ یہ رجسٹر ۱۳۶۴ھ سے ۱۳۷۰ھ تک کے درمیان کے ہیں۔فتاوی کے ساتھ درج شدہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۳۶۸ھ تک تو باقاعدہ اور اس کے بعد ۱۳۷۰ھ تک رمضان وغیرہ کی تعطیلات میں دارالافتاء کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے ہیں۔محافظ خانہ میں آپ کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ رجب ۱۳۶۹ھ میں انھوں نے ان خدمات سے معذوری ظاہر کرتے

ہوئے صرف تدریسی خدمات کی انجام دہی کی درخواست کی ہے۔

بہرحال، سبھی رجسٹروں میں حضرت شیخ الادبؒ کی تصدیقات موجود ہیں؛ البتہ بعض رجسٹروں میں فتاوی بھی ہیں، رجسٹر نمبر ۱۱ و ۱۲ میں فتاوی کی تعداد بہت ہے۔ بہرحال ان رجسٹروں کی کچھ تفصیلات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

شمار	جلد	سلسلۂ فتوی از-تا	تعداد فتاوی	تاریخ فتاوی	کچھ فتاوی/تصدیق	دیگر مفتیان
(۱)		1-931	931	محرم ۱۳۶۳ھ تا رمضان ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت قاضی مسعود احمد صاحبؒ وحضرت مفتی احمد علی سعید صاحبؒ
(۲)	الف جلد اول	1-710	710	محرم تا جمادی الآخرۃ ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۳)	الف جلد ثانی	711-1330	620	جمادی الآخرۃ تا ذوالحجہ ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۴)	ب جلد اول	1-523	523	محرم تا رجب ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت مفتی محمد فاروق صاحبؒ
(۵)	ب جلد ثانی	524-970	447	رجب تا ذوالقعدہ ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت قاضی مسعود احمد صاحبؒ وحضرت مفتی احمد علی سعید صاحبؒ
(۶)	ب جلد ثالث	971-1138	168	شوال تا ذوالقعدہ ۱۳۶۴ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۷)	الف جلد ثانی	1-357	357	شوال ۱۳۶۴ھ تا محرم ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۸)	ب جلد ثانی	581-1278	698	جمادی الاولی تا ذوالقعدہ ۱۳۶۵ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۹)	ج جلد اول	1-652	652	جمادی الآخرۃ ۱۳۶۵ھ تا محرم ۱۳۶۶ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۰)	ج جلد ثانی	652-1526	875	جمادی الآخرۃ ۱۳۶۵ھ تا محرم ۱۳۶۶ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۱)	الف جلد ثانی	492-1047	556	جمادی الاولی تا ذوالحجہ ۱۳۶۶ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۲)		1-310	310	رمضان تا ذوالحجہ ۱۳۶۷ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۳)	ب جلد اول	1-482	482	محرم تا جمادی الاولی ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۴)	الف جلد ثانی	377-764	388	جمادی الاولی تا شوال ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۵)	ج جلد ثانی	571-942	372	جمادی الآخرۃ تا شوال ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	=
(۱۶)	الف جلد ثالث	884-1170	286	شوال تا ذوالقعدہ ۱۳۶۸ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت مفتی مہدی حسن صاحبؒ
(۱۷)		1-201	201	رمضان تا ذوالقعدہ ۱۳۶۹ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت قاضی مسعود احمد صاحبؒ حضرت مفتی مہدی حسن صاحبؒ
(۱۸)		213-623	411	رمضان ۱۳۷۰ھ تا محرم ۱۳۷۱ھ	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت قاضی مسعود احمد صاحبؒ

کچھ ایسے رجسٹر بھی ہیں جن کی کچھ تفصیلات اوران کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں بھی حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی یا ان کی تصدیقات ہیں؛ لیکن وہ رجسٹر نہیں مل سکے، ان رجسٹروں کی دستیاب تفصیلات حسب ذیل ہیں:

شمار	جلد	سلسلۂ فتوی از-تا	تعداد فتاوی	سن	کچھ فتاوی/تصدیق	دیگر مفتیان
(۱)		1-246 1048-1245	246 198	۱۳۶۶ھ (رجسٹر نہیں ملا)	حضرت شیخ الادبؒ	
(۲)		1-782	782	۱۳۶۷ھ (رجسٹر نہیں ملا)	حضرت شیخ الادبؒ	
(۳)	ب جلد اول	1-839	839	۱۳۶۷ھ (رجسٹر نہیں ملا)	حضرت شیخ الادبؒ	حضرت مفتی احمد علی سعید صاحبؒ حضرت قاضی مسعود احمد صاحب
(۴)		1-854	854	۱۳۶۸ھ (رجسٹر نہیں ملا)	حضرت شیخ الادبؒ	

حضرت شیخ الادبؒ کا طرز فتوی نویسی

اس مختصر مقالے میں حضرت شیخ الادب کے فتاوی کو تفصیل کے ساتھ پیش کرنا نہ ہی ممکن ہے، اور نہ ہی اس ناچیز، کم مایہ اور کوتاہ نظر کی یہ مجال ہے کہ وہ ان کے فتاوی پر اپنی رائے پیش کر سکے؛ البتہ ان کے فتاوی کے مطالعے سے جو مجموعی تاثر اس ناچیز کے قلب و ذہن میں قائم ہوا، اسی کو نہایت اختصار کے ساتھ قلم بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کا طرزِ افتاء ان کی علمی جلالت اور فقہی بصیرت کا آئینہ دار تھا۔ ان کے فتاوی کی سب سے نمایاں خصوصیت فقہی دیانت اور سادگی تھی۔ وہ پیچیدہ فقہی مسائل کو اتنے سلجھے ہوئے اور واضح انداز میں بیان فرماتے تھے کہ سائل کو کسی قسم کے ابہام کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ ان کے ہاں عبارت آرائی کے بجائے براہِ راست مسئلے کی روح تک پہنچنے اور اسے شریعت کے مستند مآخذ کی روشنی میں حل کرنے کا خاص ذوق پایا جاتا تھا۔ حضرت شیخ الادبؒ کا طرزِ افتا اعتدال و احتیاط پر مبنی تھا۔ متبحر عالم ہونے کے ناطے مفتی بہ اقوال کو ترجیح دیتے تھے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ عرفِ زمانہ اور لوگوں کی ضرورت و حاجت کا بھی گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کے فتاوی میں جہاں ایک طرف اکابرِ دیوبند کی تحقیق کا اثر نظر آتا ہے، وہیں دوسری طرف ان کی اپنی خداداد ذہانت اور فکری استقامت بھی جھلکتی ہے۔ وہ بالخصوص معاملات اور معاشرتی مسائل میں ایسی راہ نکالنے کی کوشش کرتے تھے جس سے شریعت کی حدود بھی قائم رہیں اور عوام کے لیے حرج اور تنگی بھی پیدا نہ ہو۔ وہ

لا یعنی ابحاث اور طویل حوالہ جات سے گریز کرتے ہوئے اصل جواب پر توجہ مرکوز رکھتے تھے۔ان کے فتاوی میں علمی وقار، فکری ٹھہراؤ اور غیر جذباتی انداز نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کا طرزِ افتا فقہِ حنفی کی ایک سنجیدہ ترجمانی کا ایک تسلسل ہے، جو دیوبند کی فتوی نویسی کی روایت کی بنیاد ہے۔غرضے کہ ایک مفتیِ کامل کی جو صفات ہوسکتی ہیں، حضرت شیخ الادبؒ ان صفات کا عملی نمونہ تھے۔

ان فتاوی کا مجموعی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کے اسلوب اور حجم میں تنوع پایا جاتا ہے؛ چنانچہ بعض فتاوی نہایت اختصار پر مبنی ہیں، جب کہ بعض تفصیل اور شرح کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں۔اسی طرح استدلال کے پہلو سے بھی یکسانیت نہیں پائی جاتی؛ بلکہ سائل کے سوال کی نوعیت، اس کے علمی پس منظر اور عملی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہیں دلائل کی صراحت کی گئی ہے اور کہیں محض حکمِ شرعی پر اکتفا کیا گیا ہے۔مزید برآں، یہ فتاوی صرف کسی ایک بابِ فقہ تک محدود نہیں؛ بلکہ عبادات، معاملات وخصومات، نیز اخلاق وآداب سمیت فقہ کے تقریباً تمام اہم ابواب کا احاطہ کرتے ہیں۔

فتاوی کی تصدیق وتوثیق کرتے ہوئے وہ محض ''الجواب صحیح'' کہہ کر گزر نہیں جاتے تھے؛ بلکہ جہاں ضروری سمجھتے، وہاں فتوی کے پس منظر، اس کے ممکنہ نتائج اور عملی اثرات پر مختصر مگر بامعنی تبصرہ ضرور ثبت کرتے تھے۔اس سے ان کی فقہی بصیرت کے ساتھ ساتھ امت کے اجتماعی مفاد اور داخلی اصلاح کے لیے ان کی فکرمندی بھی نمایاں ہوتی ہے۔یہی وصف ان کو محض ایک مفتی نہیں؛ بلکہ فقیہِ مصلح کے مقام پر فائز کرتا ہے، اور دارالعلوم دیوبند کے فقہی ورثے میں ان کا اندازِ افتاء ایک مستقل اور قابلِ تقلید اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کی تعداد اور ان کی اہمیت

صفحاتِ بالا میں حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان کی روشنی میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دورِ صدارت میں بیس ہزار سے زائد فتاوی دارالافتاء سے جاری کیے گئے جن میں سے تقریباً ایک تہائی سے زیادہ فتاوی خود آپ کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔اگر ان فتاوی کو مکررات وغیرہ کے حذف کے ساتھ مرتب کیا جائے تو نو دس جلدوں پر مشتمل مجموعہ تیار ہوسکتا ہے۔

اب تک دارالعلوم دیوبند کی جانب سے اولین مفتی، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاوی کتابی شکل میں مرتب ہوکر ۱۸؍جلدوں میں 'فتاوی دارالعلوم دیوبند' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ بعد کے دارالافتاء کے صدر مفتیان میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اور

حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کے فتاوی الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں؛ لیکن حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی پر کام نہیں ہوسکا ہے۔

ترتیب زمانی کے اعتبار سے حضرت شیخ الادبؒ کا زمانہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے بعد کا ہے؛ لہٰذا اب بجا طور پر امید کی جاتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے حضرت شیخ الادبؒ کے فتاوی کی ترتیب کا کام ہوگا۔ الحمد للہ، شعبۂ ترتیب فتاوی اور شعبۂ کمپیوٹر میں ان فتاوی کی کوڈنگ اور کمپوزنگ اور اسکیننگ کا کام ہو چکا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی یہ قیمتی فتاوی مرتب ہوکر منظر عام پر آئیں گے۔

❊ ❊ ❊

مآخذ ومراجع

(۱) فائل متعلقہ حضرت شیخ الادبؒ، محفوظ محافظ خانہ، دارالعلوم دیوبند

(۲) ریکارڈ مراسلات دارالافتاء، محفوظ دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند

(۳) رجسٹر فتاوی (سنین: ۱۳۴۶ھ تا ۱۳۴۹ھ - ۱۳۶۴ھ تا ۱۳۷۰ھ)، دفتر اسکین متعلقہ شعبۂ کمپیوٹر، دارالعلوم دیوبند

(۴) کتب شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ، کمرۂ تصانیف اکابر، کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند

(۵) تذکرۃ الاعزاز، مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیری، مکتبہ ابنائے علامہ انور شاہ، دیوبند، ۱۹۵۳ء

(۶) حیات اعزاز، مولانا سید محمد عبدالاحد قاسمی، حمیدیہ لائبریری، ڈھاکہ، ۱۹۵۵ء

(۷) سوانح شیخ الادب والفقہ، مولانا افتخار علی عزیز فاضل دیوبند، میرٹھ، ۱۹۵۵ء

(۸) تاریخ دارالعلوم دیوبند، اول، سید محبوب رضوی، ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء

(۹) دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند، ۱۹۶۵ء

(۱۰) عکس احمد، مولانا محمد شکیب قاسمی ومولانا محمد نوشاد قاسمی، حجۃ الاسلام اکیڈمی دارالعلوم وقف دیوبند، ۲۰۱۴ء

❊ ❊ ❊

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری قُدس سرُّہ
ایک مدبر، متقی اور درویش صفت مہتمم
(وفات:۱۴۳۲ھ-۲۰۱۰ء)

از: مولانا عبدالرؤف غزنوی
استاذ: جامعہ علومِ اسلامیہ علّامہ بنوری ٹاون، کراچی
(سابق استاذ دارالعلوم دیوبند)

راقم الحروف کو سال ۱۴۰۱ھ میں جماعتِ دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند کے اندر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دوراہتمام میں طالبِ علم کی حیثیت سے داخلہ نصیب ہوا، اور حضرت حکیم الاسلام قدس سرُّہ نے خود ہی بخاری شریف کا افتتاح شیخ الحدیث و نائب مہتمم حضرت مولانا نصیر احمد خاںؒ کی موجودگی میں کرایا۔ اسی سال دارالعلوم دیوبند میں مجلسِ شوریٰ اور اہتمام کے درمیان اختلاف وخلفشار رونما ہوا جس کے نتیجے میں بالآخر حضرت حکیم الاسلامؒ نے مجلس شوریٰ کو اپنا استعفاء پیش کر دیا، مجلس شوریٰ نے آپ کی پیرانہ سالی اور دارالعلوم دیوبند کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے استعفاء منظور فرمالیا اور شوال ۱۴۰۲ھ مطابق اگست ۱۹۸۲ء میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کو جو سال ۱۳۸۲ھ مطابق سال ۱۹۶۲ء کو مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے اور پھر رجب ۱۴۰۱ھ مطابق مئی ۱۹۸۱ء کو مددگار مہتمم کی حیثیت سے منتخب ہو چکے تھے، مستقل مہتمم مقرر کر دیا۔ اس وقت سے اپنی وفات ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۰ء تک جو تقریباً تیس سال کا عرصہ ہے آپ نے ایسی دیانت داری واخلاص، بصیرت وتدبر اور محنت وللّٰہیت سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت انجام دی کہ قریب سے دیکھنے والے ہر شخص کی زباں پر یہی رہا کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن مؤیّد اور موفّق من اللہ مہتمم ہیں۔

آپ کے پیشرو اور سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

قدّس سرہٗ مختلف خصوصیات وامتیازات کے حامل تھے، وہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدّس سرہٗ کے پوتے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ مجاز، ایک لاثانی مقرر وخطیب، متبحر عالم، اپنے معاصر علماء میں سب سے زیادہ شہرت ومحبوبیت کے مقام پر فائز، ایک پرکشش شخصیت کے مالک اور نہایت تجربہ کار مہتمم تھے؛ جب کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ فاضل دارالعلوم دیوبند ہونے کے باوجود نہ تو مقرر تھے اور نہ ہی کسی اور خصوصی نسبت کے حامل، اور نہ ہی کوئی اعلیٰ اور امتیازی علمی مقام رکھتے تھے اور نہ شہرتِ عامہ سے بہرہ ور! اور آپ کو منصبِ اہتمام بھی ایک ایسے نازک وقت میں تفویض کیا گیا کہ دارالعلوم دیوبند سابقہ شدید خلفشار سے ابھی پوری طرح نکل بھی نہیں سکا تھا۔

مذکورہ صورتِ حال کو مدّ نظر رکھ کر یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ایک ایسی حالت میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ جیسی شخصیت کی جگہ کو پُر کرنا اگرچہ ناممکن نہ تھا؛ البتہ مشکل ضرور تھا؛ چنانچہ بعض حلقوں نے اسی انتخاب پر حیرت وتعجب کا اظہار بھی کیا؛ لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ اخلاص وتقویٰ، للّٰہیت وتدبُّر، محنت وعرق ریزی اور حکمت ودلسوزی کے اس گمنام پیکر نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صرف یہ نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کی کشتی کو مختلف خطرات سے بچا کر بحفاظت ساحل پر لگا دیا؛ بلکہ مزید ترقیات سے بھی ہمکنار کر دیا جس سے دارالعلوم دیوبند کے متعلقین اور مخلصین کے حلقوں میں یہ بات زبان زدِ خاص وعام رہی کہ دارالعلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام کے لیے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اکابر واسلاف کی دعاؤں اور مبارک توجُّہات کی برکت سے بالکل برمحل عمل میں آیا تھا۔

جب حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کو مجلس شوریٰ نے مستقل مہتمم کے طور پر منتخب فرمایا، اس وقت راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا۔ اسی دوران حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کے حکم پر مجھے دارالعلوم دیوبند کی مسجد کا امام وخطیب مقرر کیا گیا اور فراغت کے بعد مدرس کی حیثیت سے انٹرویو کے بعد احقر کا انتخاب عمل میں آیا، انٹرویو لینے والے چار حضرات تھے جن میں سے ایک حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، دوسرے حضرت مولانا نصیر احمد خان بلندشہریؒ شیخ الحدیث و نائبِ مہتمم، تیسرے حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ رکن مجلس شوریٰ اور چوتھے حضرت مولانا قاضی زین العابدینؒ رکن مجلس شوریٰ تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں راقم کی تدریس کا سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا، اس دوران حضرت

مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کو نہایت قریب سے دیکھنے اوران کے خصائل سے واقف ہونے کا موقع ملا، وہ نہ تو دارالعلوم دیوبند میں کوئی کتاب پڑھاتے تھے اور نہ ہی میرے استاذ تھے؛ لیکن ان کی عظمت،تقویٰ،سادگی،اخلاص،للّٰہیت اور پیرانہ سالی کے باوجود شب وروز دارالعلوم دیوبند کے لیے ان کی مخلصانہ خدمتوں اور کاوشوں کو دیکھ کر میرے دل میں ان کا بے حد احترام تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ جتنا قریب سے انھیں دیکھنے اوران کے حالات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہا اتنا ہی عقیدت میں اضافہ ہوتا رہا۔

کسی بھی مدرسہ کے منصبِ اہتمام یا کسی دوسرے انتظامی عہدے پر فائز ہونا اگرچہ اس اعتبار سے تو بہتر ہوتا ہے کہ وہ بشرط اخلاص و دیانتداری دین کی خدمت کا ایک اہم ذریعہ بن سکتا ہے؛ لیکن دوسرے اعتبار سے باعثِ تشویش بھی ہوتا ہے کہ خدانخواستہ اگر کوئی بے احتیاطی ہوئی یا امانت داری و انصاف سے کام نہیں لیا گیا تو پھر انسان کے لیے خطرناک بھی ہوتا ہے،اسی وجہ سے کسی ایسے عہدے پر فائز شخص اصحابِ بصیرت کی نظر میں عام طور پر قابلِ رشک نہیں ہوتا؛ بلکہ قابلِ رحم اور بعض دفعہ قابلِ افسوس بن جاتا ہے؛ اس لیے کہ انسان سے کبھی تو امانتوں میں بے احتیاطی ہوسکتی ہے، یا پھر اپنے عہدے کی وجہ سے غرور واستکبار اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرنے میں مبتلا ہوسکتا ہے اور کبھی اقربا پروری یا شہرت پسندی کا شکار بن سکتا ہے اور یہ تمام چیزیں ایک مسلمان کے لیے تباہی کے اسباب ہیں۔

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کی دارالعلوم دیوبند سے وابستگی اور پھر ان کے دوراہتمام کو قریب سے دیکھنے والے حضرات اس بات پر متفق نظر آتے تھے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا تمام خطرات سے محفوظ رکھا تھا، آپ تقریباً نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند سے اس طرح وابستہ رہے کہ تقریباً بیس سال تک مجلس شوریٰ کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے اور پھر تیس سال تک مہتمم کی حیثیت سے کام کیا، اس پورے عرصے میں ان کے موافق تو کیا کسی مخالف کی زباں سے بھی ایسا کوئی حرف ان کے متعلق نہیں سنا گیا جس سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے کسی بھی قسم کا کوئی ذاتی مفاد حاصل کیا ہو؛ بلکہ وہ حتی الامکان دارالعلوم دیوبند کی انتظامی خدمت کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر مالی خدمت بھی کرتے رہے۔ راقم الحروف مندرجہ ذیل سطور میں اختصار کے ساتھ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کے چند امتیازات وخصوصیات اس مقصد کے لیے قلمبند کررہا ہے کہ قارئینِ کرام اور بالخصوص اہل علم اور انتظامی عہدوں پر فائز حضرات ان سے استفادہ

فرمائیں۔

اخلاص وللّٰہیت

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کے اخلاص وللّٰہیت کا یہ عالم تھا کہ تیس سال تک دارالعلوم دیوبند کے منصبِ اہتمام پر فائز رہے اور پیرانہ سالی کے باوجود شب و روز محنت کی، اس طویل محنت کا کوئی دنیوی معاوضہ انھوں نے قبول نہیں کیا، نہ کوئی تنخواہ لی اور نہ ہی کوئی اور مراعات! یہاں تک کہ احاطۂ مسجد کے جس کمرے میں دارالعلوم ہی کی خدمت کی خاطر قیام پذیر تھے اس کے کرایہ اور بجلی کی مد میں اپنی ذاتی رقم دارالعلوم میں جمع کرا کر رسید کٹواتے تھے اور بالعموم جمعرات کو جب اپنے گھر بجنور تشریف لے جاتے تو آنے جانے کے لیے اپنی ذاتی گاڑی اور اپنا ہی پیٹرول استعمال فرماتے تھے۔ مجھے ایک دفعہ بھائی محمد طاہر صاحبؒ نے جو دارالعلوم دیوبند میں آپ کے پیشکار (سکریٹری) تھے بتایا کہ میں نے پیشکار ہونے کی حیثیت سے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کو بہت قریب سے تسلسل کے ساتھ دیکھا ہے، میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس شخص نے دارالعلوم دیوبند کی ملکیت میں سے ایک پان کے بقدر بھی کوئی چیز مفت میں اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لایا ہے۔

پیشکار صاحبؒ نے مزید یہ بھی بتایا کہ جب شوریٰ کے اجلاس میں معزز اراکین ہندوستان کے کونے کونے سے دارالعلوم تشریف لاتے ہیں تو جب تک ان کا قیام دارالعلوم میں رہتا ہے ان کے کھانے پینے کا خرچہ حضرت مہتمم صاحبؒ اپنی ذاتی جیب سے ادا کرتے ہیں؛ حالانکہ وہ دارالعلوم ہی کے مہمان اور دارالعلوم ہی کی خدمت کے لیے تشریف لائے ہوتے ہیں؛ لیکن حضرت مہتمم صاحب دو وجہ سے ان کے کھانے پینے کا خرچہ اپنے ذمّے لے لیتے ہیں، ایک تو یہ کہ مہتمم ہونے کی حیثیت سے ان کو بھی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں اور پھر کھانے میں شریک ہونا پڑتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ دارالعلوم کی ملکیت میں سے کھانے کا کوئی ایک لقمہ بھی مفت میں ان کے استعمال میں آجائے، دوسری وجہ یہ کہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان معزز اراکین کی ضیافت واکرام کی سعادت بھرپور طریقے سے وہ خود ہی حاصل کریں؛ اس لیے سارا خرچہ اپنے ذمّے لے لیتے ہیں۔

دیانتداری وامانت داری

آپ سخاوت و ہمدردی میں مشہور ومعروف تھے اور اپنا ذاتی مال بلا دریغ مہمانوں اور ضرورتمندوں پر خرچ کرتے تھے؛ لیکن دارالعلوم کی مالیات سے متعلق نہایت محتاط تھے، دارالعلوم کی

کسی معمولی چیز کو بھی بے محل خرچ کرنے یا نظرانداز کردینے کے روادار نہیں تھے۔ جب دارالعلوم میں کوئی تعمیراتی کام ہوتا تو وہ براہ راست نگرانی فرماتے؛ تاکہ کسی چیز کا ضیاع نہ ہو اور اگر تعمیر کے بعد سریوں کے ٹکڑے یا دوسرا کوئی فضلہ سامان رہ جاتا اس کو بھی ضائع نہیں ہونے دیتے؛ بلکہ دارالعلوم کے کسی نہ کسی کام میں ضرور لے آتے۔

بعض دفعہ مطبخ جاکر طلبہ کے لیے تیار کی جانے والی روٹیوں اور سالن کا معاینہ فرماتے اور چیک کرنے کے لیے ایک آدھ لقمہ تناول فرماتے اور پھر اس کے بدلے میں بلا تاخیر اپنی جیب سے ایک پوری خوراک کی قیمت جمع کراکر رسید کٹوا لیتے۔ اسی طرح اگر دارالعلوم کے مہان خانہ میں مقیم بعض آنے والے معزز مہانوں سے ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے اور ان کی دلجوئی کے لیے دارالعلوم کی طرف سے ان کے لیے تیار کیے جانے والے ناشتے یا کھانے میں شرکت فرماتے تو اس کی قیمت بھی بلا تاخیر اپنی جیب سے دارالعلوم میں جمع کرا دیتے۔

اقربا پروری سے اجتناب

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کی دیانتداری کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ وہ اقربا پروری کے بالکل خلاف تھے اور اس کو ادارے کے لیے ایک خطرناک عمل تصور کرتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اقربا پروری کے سدّ باب کے لیے اپنے دور اہتمام میں یہ معمول بنایا تھا کہ دارالعلوم کے کسی استاذِ محترم یا دوسرے ملازم کے کسی فرزند ارجمند کو صلاحیت کے باوجود؛ جب تک ان کے والد محترم دارالعلوم سے وابستہ ہوں دارالعلوم کا مدرس یا ملازم نہیں بنایا جائے گا؛ بلکہ اقارب کے علاوہ باصلاحیت افراد کو ترجیح دی جائے گی، اس معمول کو سب سے پہلے عملی جامہ خود حضرت والاؒ ہی نے پہنایا تھا؛ لہٰذا انھوں نے اپنے تیس سالہ دور اہتمام میں اپنے خاندان کے کسی بھی فرد کو دارالعلوم کا مدرس یا ملازم نہیں بنایا، یہاں تک کہ اپنے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمٰن قاسمی بجنوری مدظلّہم فاضل دارالعلوم دیوبند کو بھی جن کی شرافت، تقوی، سنجیدگی، معاملہ فہمی اور خوش اخلاقی سے ان کے ہر جاننے والا واقف ہے نہ تو انھوں نے اپنی زندگی میں نائب مہتمم بنایا، نہ ہی دارالعلوم کے کسی بھی شعبے سے انھیں منسلک کر دیا؛ البتہ آپ کے وصال کے بعد مجلس شوریٰ نے دارالعلوم کی خیر خواہی کے لیے آپ کے صاحبزادے جناب مولانا انوار الرحمٰن زید مجدہم کو مجلسِ شوریٰ کا رکن بنا دیا۔

ماہ رجب ۱۴۳۵ھ کو اللہ تعالیٰ نے طویل فراق کے بعد اس عاجز کو ایک مرتبہ پھر چند دن کے لیے دارالعلوم دیوبند حاضری کا موقع عنایت فرمایا، اس وقت حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کا تو

وصال ہو چکا تھا اور حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہم العالی منصب اہتمام پر فائز تھے، میں نے ان سے دفترِ اہتمام میں ان کے دونوں نائبین کی موجودگی میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کے مذکورہ بالا معمول کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ یہ معمول ان کے زمانے سے آج تک جاری ہے اور چونکہ سب کو اس معمول کا علم ہے اور اس کے مطابق تعامل برقرار ہے؛ اس لیے اس کو چیلنج بھی نہیں کیا جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اس تعامل کو باضابطہ اور تحریری طور پر دستور کا حصہ اب تک نہیں بنایا گیا ہے۔

راقم کہتا ہے کہ اس تعامل کا مشاہدہ مذکورہ بالا سفر کے دوران میں نے خود اس طرح کیا کہ وہ اساتذۂ دارالعلوم دیوبند جو بقیدِ حیات تھے ان کے صاحبزادگان میں سے کسی کو تدریس پر فائز نہیں دیکھا؛ حالانکہ ان میں سے کئی صاحبزادگان کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا کہ ان میں صلاحیت وصالحیت دونوں موجود اور دارالعلوم کے مایۂ ناز فضلاء میں ان کو شمار کیا جاتا تھا اور وہ بعض دیگر مدارس میں کامیابی کے ساتھ پڑھا رہے تھے۔

تواضع وخاکساری

اہتمام یا کسی بھی عہدے پر فائز ہونا مختلف وجوہات کی بنیاد پر انسان کے لیے ایک پرخطر وادی کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں ایک طرف اس کی دیانت داری وامانت داری کا امتحان ہوتا ہے تو دوسری طرف جاہ طلبی اور شہرت پسندی کے دلدل میں پھنسنے کا خطرہ بھی منڈلا رہا ہوتا ہے۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کو جہاں اللہ تعالیٰ نے دیانت داری وامانت داری کے میدان میں استقامت سے نوازا تھا، وہاں جاہ طلبی، شہرت پسندی اور خود پرستی سے بھی محفوظ فرمایا تھا۔

ان کی نشست و برخاست، لباس و ہیئت، طرزِ تکلم اور نقل وحرکت سے صاف طور پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ نمود ونا موری سے زیادہ گمنامی اور پوشیدگی کو پسند فرماتے تھے، نہ تو اپنی تعریف کے دلدادہ اور نہ ہی شہرت کے طلبگار تھے، وہ دارالعلوم دیوبند کے احاطۂ مسجد کے ایک معمولی کمرے میں مقیم تھے اور مسجدِ دارالعلوم میں باجماعت نماز ادا کرتے تھے، امامت کی ذمہ داری چونکہ راقم الحروف کی تھی؛ اس لیے میں نے بار بار ایسا منظر دیکھا ہے کہ وہ مسجد میں آ کر ایک نمایاں جگہ کی بجائے کسی گوشے میں نماز ادا کرنے کو ترجیح دیتے تھے اور ایسا منظر بھی بار بار مشاہدہ میں آیا ہے کہ جدید طلبہ یا دارالعلوم کی زیارت کے لیے آئے ہوئے بعض دوسرے مدارس کے طلبہ جو حضرت والاؒ کو بذاتِ خود نہیں پہچانتے تھے نماز کے وقت مسجد میں آتے ہوئے یا نماز کے بعد مسجد سے نکلتے ہوئے ان کے راستے میں

رکاوٹ بن جاتے تھے؛ بلکہ بعض دفعہ جلدی میں ان سے ٹکراتے بھی تھے اوران کی خاکساری وفروتنی کو دیکھ کر وہ ہرگز یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ شخص اس عظیم بین الاقوامی دینی درسگاہ کے عظیم المرتبت مہتمم ہوں گے اور نہ وہ خود کسی کو اس کا احساس دلانے کی کوشش فرماتے۔

تقویٰ اور رجوع الی اللہ

آپ کے تیس سالہ دور اہتمام کی ابتداء سے لے کر دس سال تک راقم الحروف مدرس اور امام و خطیب کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں مقیم رہا، اس دوران حضرت والاؒ کو بہت قریب سے دیکھا، آپ کی عمر اس وقت سترّ اور اسّی سال کے درمیان چل رہی تھی، اس پیرانہ سالی میں بھی تمام نمازیں جماعت وتکبیر تحریمہ کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا آپ کا معمول رہا، اس کے علاوہ نوافل، ذکر واذکار، اوراد ووظائف اور رجوع الی اللہ کے بھی پابند رہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل ایک چشم دید واقعہ نمونے کے طور پر قلمبند کیا جارہا ہے:

''دارالعلوم دیوبند کی مایۂ ناز مسجد ''جامع رشید'' کی بنیاد بروز جمعہ ۱۴۰۶/۷/۲۳ھ مطابق ۱۹۸۶/۴/۴ء رکھی گئی، اس کے بعد باقاعدہ تعمیری کام شروع ہوا تو حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ نے احقر پر اعتماد کرتے ہوئے اس مسجد کی نگرانی اور تعمیری سامان کی دیکھ بھال ایک اضافی کام کے طور پر میرے سپرد کردی، مجھے چونکہ نہ تو اس کام کا کوئی تجربہ تھا اور نہ دلچسپی؛ اس لیے میں نے معذرت کرتے ہوئے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ تدریس وامامت کے ساتھ ایسا کام کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے؛ لیکن حضرت والاؒ نے ہمت دلاتے ہوئے میری معذرت کا راستہ بند کردیا اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے کا حکم دیدیا۔

میں نے حسب الحکم نگرانی شروع کی؛ لیکن چند ہی روز کے اندر اندازہ ہوا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں، مطالعہ میں دشواری اور اسباق کی تیاری میں پریشانی محسوس ہورہی ہے، تو میں نے اس کام سے معذرت پیش کرنے کے لیے حضرت مہتمم صاحبؒ سے دفتر اہتمام کی بجائے ان کے کمرے میں چاشت کے وقت خصوصی ملاقات کا ارادہ کیا؛ اس لیے کہ دفتر اہتمام میں رش کی وجہ سے یکسوئی کے ساتھ بات نہ ہو پاتی۔ جب میں چاشت کے وقت ان کے کمرے کے دروازے تک پہنچا تو سلام کرنے اور اجازت لینے سے قبل میں نے دیکھا کہ وہ چاشت کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جائے نماز پر قبلہ رخ بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے زار وقطار اپنے رب کے سامنے رورہے ہیں، انھوں نے مجھے نہیں دیکھا؛ لیکن میں نے اس منظر کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے پیچھے ہٹنے

اور انتظار کرنے کو مناسب سمجھا، اس دوران مجھ پر یہ تصور کرتے ہوئے رقّت طاری ہوگئی کہ یہ اللہ کے نیک بندے اس عمر میں ایک طرف تو شب و روز دارالعلوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے اتنا گہرا تعلق کہ اپنی تنہائی میں پروردگار کے سامنے اتنی لجاجت کے ساتھ رو رو کر دعا کر رہے ہیں! اور یہ بھی ذہن میں آیا کہ جب ادارے کے مہتمم وسربراہ کا اللہ تعالیٰ سے اتنا گہرا تعلق ہو تو ان شاء اللہ وہ ادارہ ترقی کے راستے پر گامزن رہے گا اور کوئی بھی بادِ مخالف اس کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔ تھوڑی دیر تک اس تصور میں ڈوبا رہا اور جب اندازہ ہوا کہ آپ اپنے معمول سے فارغ ہوگئے ہوں گے تو آگے بڑھ کر سلام کرنے کے بعد اندر جانے کی اجازت طلب کی، انھوں نے بڑی خوشی کے ساتھ اجازت دی۔

اندر جانے کے بعد میں نے حضرت والا سے بڑے ادب کے ساتھ جامع رشید کے تعمیری کام کی نگرانی سے معذرت پیش کردی، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک غیبی مدد تھی کہ مجھ پر رقت کی جو کیفیت حضرت مہتمم صاحبؒ کی دعا کی کیفیت کو ان کی لاعلمی میں دیکھ کر طاری ہوگئی تھی ابھی اس کے کچھ اثرات میرے چہرے اور شاید آنکھوں میں بھی باقی تھے، حضرت مہتمم صاحبؒ نے میری کیفیت کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ شاید میں مذکورہ کام کی نگرانی سے اس حد تک پریشان ہوں کہ میری ایسی کیفیت ہوگئی ہے؛ لہٰذا انھوں نے میری معذرت منظور فرما کر مذکورہ کام حضرت مولانا عبدالخالق مدراسی زیدمجدہم موجودہ نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حوالے کردیا جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیت، مسلسل محنت اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔''

ایک مؤدبانہ التماس

اہل علم اور بالخصوص ارباب انتظام حضرات سے یہ مؤدبانہ گزارش کی جاتی ہے کہ اپنے اکابر کے حالات، ان کی زندگیوں کے نقوش، ان کی احتیاط ودیانت داری، ان کے اخلاص وللّٰہیت اور ان کے رجوع الی اللہ کی کیفیت کو ہمیشہ یاد رکھا جائے اور ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی جائے، ان کے حالات کا تذکرہ اپنی مجالس وگفتگو کا حصہ بنا دیا جائے اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو ان کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی عادات وخصائل کو اپنانے کی ترغیب دی جائے، اس سے کافی حد تک فائدہ ضرور ہوتا ہے، وذکّر فَإن الذکریٰ تنفع المؤمنین۔

وفات اور نماز جنازہ

اللہ تعالیٰ کا حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ کے ساتھ ایک خصوصی فضل وکرم کا معاملہ یہ رہا

کہ انھوں نے تقریباً سوسال کی عمر پائی اور آخر تک حواس برقرار رہے اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت للہ فی اللہ کرتے ہوئے درست فیصلے کرتے رہے۔ان کی زندگی اوراعمالِ صالحہ کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل وہ حدیث یاد آتی ہے جو امام ترمذیؒ نے حَسن سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی ہے کہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ لوگوں میں بہتر آدمی کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا ”من طال عمرهُ و حَسُنَ عَمَلُه“ (جس کی عمر لمبی اور عمل نیک ہو)، مذکورہ حدیث کی روشنی میں قوی امید کی جاسکتی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوریؒ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں شامل ہوں گے۔

آپ نے یکم محرم الحرام ۱۴۳۲ھ مطابق آٹھ دسمبر ۲۰۱۰ء کو بروز چہارشنبہ سن ہجری کے اعتبار سے تقریباً سوسال کی عمر میں اورسن میلادی کے اعتبار سے تقریباً چھیانوے سال کی عمر میں بجنور میں داعی اجل کو لبیک کہا،نماز جنازہ دارالعلوم دیوبند میں ہزاروں علماء،طلبہ اور عامۃ المسلمین نے آپ کے صاحبزادے جناب مولانا انوارالرحمٰن قاسمی بجنوری زیدمجدہم کی اقتداء میں ادا کی اور ”قبرستان قاسمی“ میں تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعمالِ صالحہ اورطویل دینی خدمات کوقبول فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور پسماندگان ومتعلقین کوصبرجمیل عطافرمائے!

❋ ❋ ❋